

"لوگ اسے عینک کہتے ہیں مگر میرے خیال میں یہ صرف کانچ کے ٹکڑے
ہیں، جو کمانی میں پھنسا دیئے گئے ہیں۔۔ ۔۔

"۔۔ لیکن کانچ کے یہ ٹکڑے معمولی بھی نہیں ہیں کیونکہ جب میں
انہیں اپنی آنکھوں پر رکھتا ہوں تو وہ سب کچھ جو اس سے پہلے نظر نہیں
آتا تھا، یا جو پھیکا، پھیلا پھیلا گورکھ دھندہ سا جان پڑتا تھا۔۔۔ وہ
سب کچھ صاف صاف نظر آنے لگتا ہے۔"

کرشن چندر

کرشن چندر کے پاس ایسی آنکھیں ہیں جو واقعات اور اشیاء کے پردے
کو چاک کر کے ان کی حقیقت کو دیکھ لیتی ہیں۔

"کانچ کے ٹکڑے" حقیقی واقعات کو تخیل کی چاشنی دیکر کبھی افسانے
تو کبھی طنز کے سانچے میں ڈھالنے کا ایک بالکل نیا اور انوکھا تجربہ ہے۔



ہند

پاکٹ

بکس

پرائیویٹ لمیٹڈ
جی۔ٹی۔روڈ
شاہدرہ، دہلی ۳۲

کرشن چندر

کانچ کے ٹکڑے





KANCH KE TUKRE : STORIES

KRISHAN CHANDER

قیمت ایک روپیہ

فہرس

(کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی)

پالنا

میرے ہاتھ میں ایک عینک ہے۔

لوگ اسے عینک کہتے ہیں مگر میرے خیال میں یہ صرف کانچ کے ٹکڑے ہیں جو پلاسٹک کی کمانی میں پھنسا دیئے گئے ہیں۔ جس طرح سماج کی کمانی میں آدمی کی زندگی پھنسا دی جاتی ہے . . . . یہ زندگی ٹوٹ سکتی ہے مگر اس کمانی سے باہر نکل نہیں سکتی ——— یہی حال کانچ کے ان دو ٹکڑوں کا ہے۔

مگر پلاسٹک کی کمانی میں پھنسے ہوئے کانچ کے یہ دو ٹکڑے معمولی بھی نہیں ہو سکتے کیونکہ جب میں انہیں اپنی آنکھوں پر رکھتا ہوں تو تعجب ہونے لگتا ہے، یہ سب کچھ جو اس سے پہلے نظر نہیں آتا تھا یا جو پھیکا، پھیلا پھیلا گو رکھ دھندا سا لگتا تھا، یا جو اڑے اڑے سے دھندلکے میں لپٹا ہوا، دھول مٹی میں اٹا ہوا دکھائی دیتا تھا، وہ سب کچھ صاف صاف نظر آنے لگتا ہے۔ جیسے دھند چھٹ گئی ہو، غبار دھل گیا ہو اور ہر چیز فوکس میں ہو ——— میرے خیال میں کانچ کے ٹکڑوں کا اور کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو، اتنا فائدہ تو ضرور ہے کہ یہ ٹکڑے انسان کی آنکھوں کو ٹھیک کر دیتے ہیں۔ یوں تو ہر انسان

کے پاس آنکھیں ہوتی ہیں، آنکھوں میں نظر ہوتی ہے، نظر میں نگاہ ہوتی ہے، مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان آنکھیں ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھتا، نظر رکھتے ہوئے بھی اندھا رہتا ہے، نگاہ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں سمجھتا اور وہ ایسا محسوس کرتا ہے جیسے اس کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں ہوں اور بیچ میں اندھیرا ہو۔

مگر یہ کانچ کے ٹکڑے بڑے عجیب ہیں، یہ دیواروں کے آر پار دیکھ لیتے ہیں جہاں اندھیرا ہوتا ہے وہاں روشنی لیکر پہنچ جاتے ہیں۔ یہ چاہیں تو وقت تھم جائے، آگے بہنے لگے یا پیچھے کو چلنے لگے۔ نظر جب ان ٹکڑوں میں سے گذرتی ہے تب روشنی سے زیادہ تیز رفتار ہو جاتی ہے۔ کبھی یہ نظر پوری کائنات کو گھیرے میں لے لیتی ہے اور کبھی ایک بوند پر ہی جم کر رہ جاتی ہے۔

ہر روز صبح کا اخبار میں کانچ کے انہیں ٹکڑوں کی مدد سے پڑھتا ہوں مگر ان کا برتاؤ میری آنکھ کے ساتھ کچھ عجیب سا ہے۔ مثال کے طور پر میں آج صبح کے اخبار میں پردھان منتری کا بھاشن پڑھنا چاہتا تھا مگر یہ کانچ کے ٹکڑے شاید کچھ اور ہی پڑھنا چاہتے تھے۔ جیسے ہی میں نے پردھان منتری کی تقریر پڑھنی شروع کی، عین اسی وقت اخبار کے حروف میری نظر کے نیچے سے پھسلنے لگے اور پگھل کر اپنی شکل کھونے لگے۔ پھر بڑے بڑے دائرے بن کر میری آنکھوں کے گرد ناچنے لگے۔ پریشان ہو کر میں نے اپنی نظر وہاں سے ہٹالی۔ سوچا، چلو پردھان منتری کا بھاشن نہ سہی، کوئی دوسری ہی خبر پڑھیں گے۔ ذرا معلوم تو کریں افریقہ میں کیا ہو رہا ہے۔ یہ جاننے کے لئے میں نے اخبار کا پنا پلٹا، تو میری نظر پھسلتے پھسلتے افریقہ کی خبر سے بھی نیچے پھسلتی ہوئی ایک تصویر پر پہنچکر رک گئی۔ اور کانچ کے ٹکڑے فوکس میں آگئے۔

یہ افریقہ کے کسی بڑے نیتا کی تصویر نہ تھی، یہ دلی میں دریا گنج کے یتیم خانے کی ایک تصویر تھی۔ جس کے باہر ایک پالنا لٹکا ہوا تھا، تاکہ لوگ باگ حرامی بچوں

کو کسی گندی موری میں ڈالنے یا کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر پھینکنے کے بجائے اس پالنے میں ڈال جائیں. کس قدر بڑھیا، عمدہ اور نیک خیال آیا تھا کسی کو۔ جس کسی نے یہ ترکیب نکالی تھی، اس کے تیز ذہن کی داد نہ دینا بڑے ظلم کی بات ہوگی.

میں نے پلک جھپکا کر غور سے اس پالنے کی طرف دیکھا تو ـــــــ تو پلک جھپکتے ہی میں خود وہاں موجود تھا.

پکے رنگ کی ایک عورت اس پالنے میں ایک بچہ رکھ کر جلدی سے بھاگی جا رہی تھی: "ارے ارے، ٹھہرو"! میں نے چلا کر کہا ـــــ مگر مجھے دیکھتے ہی وہ اور بھی تیزی سے بھاگ نکلی اور گلی کے نکڑ پر غائب ہوگئی ـــــــ میں نے ایک نظر سے پالنے میں پڑے بچے کی طرف دیکھا، دوسرے ہی لمحہ میں اس عورت کی طرف بھاگا. گلی کے آخری موڑ پر میں نے اسے جا پکڑا. وہ ہانپتی کانپتی ایک ڈرگ سٹور کے خالی برآمدے میں بیٹھ گئی۔ مجھے اپنے پاس آتا دیکھ کر اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے پاس جا کر کہا: "تمہیں شرم نہیں آتی، اپنا بچہ اس پالنے میں چھوڑ آئی ہو"

بالکل پاس سے اسے دیکھا تو محسوس ہوا کہ میرا اس سے یوں سوال کرنا ٹھیک نہ تھا، کیوں کہ وہ عمر کے اس حصے سے گذر چکی تھی جب عورتوں کے بچہ پیدا ہوتا ہے۔

اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا، کیوں کہ وہ بے حد گھبرائی ہوئی تھی، اس نے میرے دونوں پاؤں پکڑ لئے اور ران پر اپنا سر رکھ دیا۔

"یہ کس کا بچہ ہے"؟ میں نے کڑک کر پوچھا۔

"میری لڑکی کا" اس نے روتے ہوئے جواب دیا۔

"کہاں رہتی ہو"؟

"سری والاں کی گلی میں"

"بچے کو واپس لے جاؤ"۔

"نہیں نہ جا سکتی"۔ بڑھیا نے روتے روتے اپنا سر اوپر اٹھایا۔ "ابھی تو میں اپنی لڑکی کو بھی محلے میں واپس نہیں لے جا سکتی، لوگ کیا کہیں گے؟ ابھی تو میری لڑکی کنواری ہے۔ پھر یہ بچہ کہاں سے آیا؟ بچی کے باپ کو تو اس کا کچھ پتہ نہیں ہے، اسے معلوم ہو گیا تو وہ میری بٹیا کو جان سے مار ڈالے گا"۔

"اور وہ بدمعاش کہاں ہے، جس نے ...... جس نے ...... "

"اس نے اپنا تبادلہ باہر مدراس میں کرا لیا ہے۔ پہلے تو کہتا تھا میں شادی کروں گا، پھر چپکے سے تبادلہ کرا کے مدراس چلا گیا"۔

"تو مدراس میں جا کر پکڑ لو۔ اس پر مقدمہ چلا دو"۔

"کتنی بدنامی ہوگی بیٹا۔ سارے خاندان کی ناک کٹ جائے گی۔ ذرا سوچو تو، ابھی تو میری بٹیا کنواری ہے۔ ابھی تو کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے۔ ابھی تو کسی دوسری جگہ بھی میں اس کی شادی کر سکتی ہوں"۔

میں اس بڑھیا کے پاس بیٹھ گیا اور بڑے میٹھے لہجے میں سمجھانے کی کوشش کرنے لگا ——— "ذرا سوچو تو ماں! تم اس بچے کی نانی ہو۔ وہ تمہارا نواسہ ہے۔ جیون بھر شاید تم نے اپنے نواسے کو گود میں کھلانے کا سپنا دیکھا ہوگا اور آج تم اسے یتیم خانے کے پالنے میں چھوڑ آئی ہو! ذرا سوچو تو ماں! تمہاری بیٹی کا پہلا بچہ کس ماحول میں پلے گا۔ میں تم سے کہتا ہوں تم اس بچے کو واپس لے جاؤ۔ اسے ماں کا پیار دو۔ نانی کا لاڈ اور چاؤ دو۔ اسے تمہارے گھر میں جینے کا اتنا ہی حق ہے جتنا تمہاری لڑکی کا۔ رہا شادی کا سوال، سو ہمارا دیش اب اتنا پچھڑا ہوا نہیں ہے۔ آج تمہیں اونچے آدرش رکھنے والے ایسے ہزاروں نوجوان مل جائیں گے جو تمہاری لڑکی کی دکھ بھری

کہانی سنکر اس سے بیاہ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔"

بڑی اچھی تقریر تھی، اس وقت خود اس تقریر کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میری تقریر سنکر اس بڑھیا کے چہرے پر رونق آ گئی اور اس کی آنکھوں میں آشا کی کرنیں جھلکنے لگیں۔ اس نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور امید بھرے لہجے میں بولی ——— "بیٹا کیا تم ... ... تم ... ... میری بٹیا سے شادی کرو گے؟"

"میں؟" میں ایک دم گھبرا گیا ——— "میری بات اور ہے میرا مطلب ہے کہ ... ... میری شادی ہو چکی ہے۔" میں نے صاف جھوٹ بول دیا۔

وہ بڑھیا میری طرف اس طرح دیکھنے لگی جیسے اپنے سامنے کسی دوسرے جامی بچے کو دیکھ رہی ہو۔ بہت دیر تک چپ چاپ دیکھتی رہی۔ پھر جب میں نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں تو اس نے آہ بھر کر کہا ——— "ہے رام!" اور اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھی اور میری طرف دیکھے بغیر وہاں سے چپ چاپ چلی گئی۔

میں پالنے کی طرف چلا آیا اور ایک ایسی جگہ چھپ کر بیٹھ گیا جہاں سے میں پالنے کو صاف دیکھ سکتا تھا لیکن کوئی دوسرا مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے اس بڑھیا کے سوال پر بڑا غصہ آیا تھا۔ ہنہہ، گناہ کوئی کرے اور سزا میں بھگتوں! عیش کرے دوسرا اور قیمت چکاؤں میں! ایسا احمق میں نہیں ہوں! اور پھر بھئی یہ کہاں کی تک ہے کہ جو کوئی اچھا مشورہ دے اسی کے گلے میں منڈھ دیا جائے وہ مشورہ! میرے کہنے کا مطلب تو صرف یہ تھا کہ اس دیس میں سینکڑوں ایسے اونچے آدرش والے نوجوان ہوں گے ... ... جو ... ... میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اونچے آدرش والا نہیں ہوں ... ... مگر ... ... بھئی، میں نے اپنے من میں اپنی ہونے والی بیوی کی جو تصویر بنا رکھی ہے، وہ اس لڑکی سے الگ

ہے اور یہ بات بھی ہے کہ ابھی میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔ بھلا کوئی زبردستی ہے۔
لیکن مجھے ان عورتوں پر بڑا غصہ آرہا تھا جو ماں بن کر اپنی ممتا کو بھول جاتی ہیں، جو اپنے بچے کو دغا دے جاتی ہیں، اور اسے بے آسرا کر کے یتیم خانے کے پالنے میں چھوڑ جاتی ہیں۔ میں نے سوچا میں آج دن بھر اس پالنے کی چوکسی کروں گا اور اگر میں دن بھر میں ایک عورت کو بھی شرم دلا کر بچہ واپس لے جانے کے لئے مجبور کر سکا تو میری کاوش بے کار نہ جائے گی۔
مجھے زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد ایک نوجوان لڑکی آئی اور گرم کپڑوں میں لپٹا ہوا ایک پارسل سا پالنے میں رکھ کر بھاگی۔ یکایک پارسل رونے لگا اور میں اس لڑکی کے پیچھے بھاگا۔ وہ لڑکی مجھے اپنا پیچھا کرتے دیکھ کر ایسی ہڑبڑائی کہ ایک سائیکل سوار سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ دو چار گلیوں میں گھومتی گھامتی آخر میں وہ پچھواڑے کی اس سڑک پر آئی جو دریا گنج میں شہر کی پرانی فصیل کے کنارے کنارے جاتی ہے۔
وہ بار بار مڑ مڑ کر میری طرف دیکھتی جاتی اور میں اس سے چالیس پچاس فٹ کا فاصلہ رکھ کر اس طرح چل رہا تھا جیسے میں اس کا پیچھا کرنے کے لئے نہیں بلکہ چہل قدمی کے لئے اس کے پیچھے نکلا ہوں۔
دریا گنج سے باہر نکل کر وہ لڑکی فصیل کے باہر دیوار کے کونے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے سامنے مرحوم آصف علی کا بت تھا۔ پاس والے میدان میں گھوڑوں کی نمائش ہو رہی تھی۔ اس لڑکی کے بالکل نزدیک بائیں طرف ایک گہری کھائی تھی، جسے میونسپلٹی والے کھود کر بھول گئے تھے کہ کس مقصد کے لئے کھودی گئی تھی۔ داہنی طرف ایک فلم کا بہت بڑا اشتہار تھا۔ "دل اپنا اور پریت پرائی"۔

میں بڑے اطمینان سے سگریٹ جلا کر آہستہ آہستہ اس لڑکی کے قریب پہنچ گیا
وہ منہ پھیرے کھڑی تھی۔

"ہیلو!" میں نے دھیرے سے پوچھا "پریت پرائی کا نتیجہ کیا نکلا؟"

یکایک وہ میری طرف گھومی اور مجھے آگ برساتی ہوئی نظروں سے تاکتے ہوئے بولی "اگر تم نے میرا پیچھا کیا تو میں پولیس میں تمہاری رپورٹ کر دوں گی"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ تھانے چلو اور میری شکایت کر دو، اور میں اس لڑکی کی شکایت کر دوں جو ابھی ابھی اپنا بچہ یتیم خانے کے پالنے میں رکھ کر آئی ہے۔"

"یہ سراسر جھوٹ ہے، اس کا تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟"

"ثبوت تو ڈاکٹر دیں گے"! میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کی شعلے برساتی ہوئی نظریں بجھ سی گئیں، جیسے بجلی کا سوئچ اک دم آف ہو جائے۔ اس کے خوب صورت چہرے پر اندھیرا سا چھا گیا، اس کے نازک و پتلے ہونٹ کانپنے لگے اور اس نے دھیرے سے پوچھا "تم کتنا روپیہ چاہتے ہو؟"

"تم کتنا دے سکتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

ہمارے سامنے سے پولیس کا ایک سنتری ہمیں گھورتے ہوئے گذر گیا۔ وہ بے حد گھبرا گئی۔ بولی۔

"چلو موٹر میں چل کر بیٹھو، وہاں باتیں کریں گے"

"تو تم موٹر میں آئی ہو" میں نے دل ہی دل میں کہا، اور اس کے ساتھ ساتھ ہو لیا۔ جب میں چھوٹے سے پارک کو جس میں مرحوم آصف علی کا بت تھا، اس کے ساتھ ساتھ پار کر رہا تھا، تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ اونچے پورے قد کی لڑکی ہے جس کی کمر پتلی بل کھاتی سی لچکتی ہے، جس کے بالوں میں شوخی کے پھول کی مہک

آنی ہے رجس کی ساڑی کا کپڑا بے حد مہنگا ہے، جس کی کار کا ماڈل صرف دو سال پرانا ہے۔

پارک سے گذر کر ہم سڑک کو بھی پار کر گئے اور اس کی موٹر میں گھس کر پچھلی سیٹ پر جا بیٹھے۔ لڑکی نے بیٹھتے ہی اپنے کانوں کی بالیاں اتاریں، پھر اس نے اپنے ہات کا جڑاؤ کنگن اتارا اور اپنا پرس کھول کر اس میں سے پانچسو روپیہ نکالا اب کچھ میرے ہات میں دیکر کہا "یہ لو سنبھالو ان کو اور میری جان بخشو"!

"یہ تو بہت کم ہیں!" میں نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"تو اور تم کیا لوگے۔" مغرور اور بدمزاج لڑکی نے تیز لہجے میں سوال کیا۔

"میں چاہتا ہوں، تم اپنے بچے کو واپس لے جاؤ۔"

"ناممکن ہے ... ... میں کنواری ہوں۔"

"کنواری تو نہیں ہو۔ یوں کہو کہ تم بیاہتا نہیں ہو۔"!

"اچھا یوں ہی سہی ... ... پھر؟"

"پھر تم اس لڑکے سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں، جس سے تمہیں اتنا پریم ہے۔ تم خوب صورت ہی نہیں، بے حد حسین ہو۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ وہ کیوں تم سے شادی نہیں کرے گا۔"

"وہ تو شادی کرنا چاہتا ہے مگر میں نہیں کرنا چاہتی۔"! وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

"شاید اس واقعہ کے بعد تمہیں اس سے نفرت ہو گئی ہے" میں نے پوچھا۔

"نہیں مجھے تو اس سے گہری محبت ہے۔" وہ بولی۔

"تمہیں اس سے محبت ہے" میں حیران ہو کر چلایا۔ "وہ تم سے شادی بھی کرنا چاہتا ہے، پھر تم کیوں نہیں کرتیں۔"؟

"کیوں کہ وہ غریب ہے، میرا خرچ برداشت نہیں کر سکتا۔"

"تو تم اپنا خرچ کم کر دو۔"

"یہ ناممکن ہے۔" وہ لڑکی پھر دو ٹوک لہجے میں بولی۔

"میری سب سہیلیوں نے بڑے بڑے لوگوں سے شادیاں کی ہیں میں بھی ویسا ہی کروں گی۔ آخر میں نئی دلی میں ایک بہت بڑی نوکری کرتی ہوں میں ایک غریب آدمی سے شادی کیسے کر سکتی ہوں۔"

"آئی سی۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو تم ایسا کرو کہ یہ بچہ جو تم دونوں کی محبت کا پھل ہے، اس کے باپ کو دیدو۔ میرا یقین ہے کہ وہ اسے تمہارے پیار کی آخری نشانی سمجھ کر نہیں لوٹائے گا۔"

"میں اسے یہ بچہ نہیں دے سکتی۔"

"کیوں؟"

"کیوں کہ یہ اس کا بچہ نہیں ہے جس سے مجھے محبت ہے۔"

"جس سے تمہیں محبت ہے، یہ اس کا بچہ نہیں ہے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ "تو پھر یہ کس کا بچہ ہے؟"

"یہ میرے ایک دوست کا بچہ ہے۔"

"تو یہ بچہ تمہارا نہیں ہے؟"

"بچہ تو میرا ہے، لیکن اس سے نہیں ہے جس سے مجھے پریم ہے۔ اس بچہ کا باپ دراصل ایک بزنس مین ہے جو میرا دوست ہے۔"

"تو تم اس بزنس مین سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟ وہ تمہارا خرچ یقیناً برداشت کرے گا اور اس غریب بچے کو اس کا باپ بھی مل جائے گا۔"

"نہیں میں اس بزنس مین سے شادی نہیں کر سکتی۔" وہ بڑے دھیرج

اور شانتی سے بولی: "وہ مجھے پسند نہیں ہے۔"

"جو تمہیں پسند ہے، اس کا یہ بچہ نہیں ہے، اور جس کا یہ بچہ ہے وہ تمہیں پسند نہیں ہے، تو پھر تم شادی کروگی تو کس سے کروگی؟ تمہارا پرابلم تو بہت کٹھن ہوتا جا رہا ہے"!

"خوب صورت لڑکیوں کا پرابلم بہت جلد حل ہو جاتا ہے مسٹر!" وہ ہنسنے لگی اور اس کے خوشنما دانت کچھ لمحہ تک اس کے گلاب کی نازک پنکھڑیوں جیسے لبوں میں چمک گئے۔

وہ خوب صورت تو ضرور تھی مگر اس کی خوب صورتی کو دیکھ کر سخت اور چمکیلی چیزوں کا خیال آتا تھا جیسے بلور، سونا، موتی، ہیرا، خوبصورت لیکن سخت!

اس نے میرا بازو تھپک کر کہا: "گھبراؤ نہیں مسٹر! میری چنتا نہ کرو، مجھے ضرور میرے مطلب کا شوہر مل جائے گا۔ ایسا، جو میرے غریب عاشق کی طرح خوب صورت اور میرے دوست بزنس مین کی طرح مالدار ہوگا اور میری پسند کا ہوگا۔" اس نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا: "اب تم اپنا مال اٹھاؤ اور گاڑی سے نیچے اتر جاؤ جلدی کرو۔"

میں جم کر سیٹ پر بیٹھ گیا: "اچھا یہ بات ہے تو تم اس گاڑی سے نیچے اتر جاؤ۔"

"میں کیوں اتروں؟" وہ حیران ہو کر بولی۔

"اس لئے کہ اگر تم اپنی پسند کی خاطر اپنے بچے کو قربان کر سکتی ہو تو اسی پسند کے لئے تمہیں اس گاڑی سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے کیوں کہ یہ گاڑی مجھے پسند ہے۔ یہ گاڑی میرے نام لکھ دو، ورنہ چلو تھانے۔"

"اے مسٹر!" وہ لڑکی اک دم چیخ کر بولی، اس نے زور سے میری کلائی پکڑلی اور اپنے لمبے لمبے ناخن اس میں گاڑ دیئے۔ "مسٹر! یہ تمہیں سب کچھ

دے سکتی ہوں مگر یہ گاڑی نہیں دے سکتی۔ اس گاڑی کے لئے تو میں نے یہ بچہ پیدا کیا ہے۔ میری سب سہیلیوں کے پاس گاڑیاں ہیں سبھی اپنی اپنی گاڑیوں پہ اٹھلا کر چڑھتی ہیں اور بات بات میں گاڑی کا رعب جتاتی ہیں۔ حالاں کہ مجھے معلوم تھا کہ ان میں سے دو نے اسی طرح گاڑیاں حاصل کی تھیں جس طرح میں نے حاصل کی ہے ... سو ہاؤ کڈ آئی ٹولریٹ اِٹ؟ میں نے بھی اس بزنس مین سے دوستی کر لی جو دو سال سے میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اس گاڑی کے لئے تو میں نے یہ بچہ پیدا کیا ہے اور تم چاہتے ہو کہ میں یہ گاڑی تمہیں دے دوں؟ آر یو نٹس؟ (Are you nuts ?)

وہ لڑکی واقعی مجھ سے خفا تھی۔ اس کا سفید شفاف چہرہ اک دم سرخ ہو گیا وہ میری طرف اتنی سخت نفرت سے دیکھ رہی تھی جیسے میں نے اس سے اس کی کار نہ مانگی ہو بلکہ اس کی عصمت مانگ لی ہو۔ وہ بار بار اپنا نچلا ہونٹ چبا رہی تھی ... میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔

تھوڑی دیر بعد جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اس نے اپنے ناخن میری زخمی کلائی سے باہر نکال لئے۔ پلکیں گالوں پر گرا لیں اور بڑی کمزور آواز میں بولی: "یہ گاڑی تو میں تمہیں نہیں دے سکتی اور تم جو چاہو ... ..."

میں نے جھنجلا کر کہا: "اب میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ کوئی ایسی ترکیب ہو جائے جس سے تمہاری جیسی مائیں بچے نہیں، بے بی آسٹین جنا کریں، ریڈیو جنا کریں، ریفریجیٹر جنا کریں۔ اگر ایسا ممکن ہو تو اس دنیا میں حرامی بچوں کی تعداد ایک حد تک کم ہو جائے گی۔" یہ کہہ کر میں نیچے اترا اور اس گاڑی کا دروازہ زور سے بند کر دیا۔ پھر جلدی جلدی اپنے پالنے والے اڈے کی طرف چلا گیا۔

شام تک کوئی نہ آیا، پالنا خالی ہی رہا۔ رات کا اندھیرا بڑھتا گیا اور

دل کا سناٹا گہرا ہوتا گیا۔ گلی کے کالے اور پھٹے ہوئے ہونٹوں میں بجلی کے دو چار
پیلے پیلے بلب مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔

نو بجے کے قریب جب مجھے زور کی بھوک لگی تب میں نے واپس گھر کی طرف
چلنے کی ٹھانی۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ ایک میلے کچیلے لبادے میں لپٹی ہوئی ایک
مریل سی عورت اس پالنے کے سامنے آکر رکی، دیر تک رکی رہی۔ پھر اس نے
جھک کر اپنے لبادے میں سے کچھ نکالا اور اس پالنے میں رکھ دیا۔ وہ دیر تک
وہاں کھڑی رہی، پھر دھیرے دھیرے واپس ہونے لگی، سر جھکائے ہوئے۔
میں اس کا پیچھا کرنے والا ہی تھا کہ اس اندھیری چھایا میں وہ عورت پلٹتی ہوئی
دکھائی دی، واپس آکر بچے کو اٹھایا اور گلے سے لگایا، پھر واپس چل دی۔
گلی کے موڑ پر پہنچ کر وہ پھر پلٹی، جلدی سے آکر اس نے بچے کو پھر پالنے میں
رکھ دیا اور تیز قدموں سے گلی سے باہر بھاگ گئی۔

سنگھ برادرس کے موٹر مرمت کرنے والے گیرج کے پیچھے سے جو راستہ
لال قلعہ کی فصیل کو جاتا ہے، اُدھر جاتے جاتے میں نے پیچھے سے جھک کر چلنے
والی عورت کا لبادہ کھینچ لیا۔ میری حیرت کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ
میں جسے عورت سمجھ رہا تھا وہ ادھیڑ عمر کا مرد ہے۔ اس کے چہرے پر کئی دن کی
بڑھی ہوئی داڑھی تھی اور اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔

میں نے اس سے سخت لہجہ میں پوچھا: "تم کس کا بچہ اس پالنے میں چھوڑ
آئے ہو؟"

کچھ لمحے وہ میری طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا اور گڑگڑا کر کہنے
لگا: "مجھے معاف کر دو حوالدار جی!"

اس نے شاید مجھے سی، آئی، ڈی کا کوئی افسر سمجھا تھا تبھی اس طرح گڑگڑا کر

معافی مانگ رہا تھا۔ میں نے بھی اس کی غلط فہمی کو دور کرنا مناسب نہیں سمجھا، پھر سختی سے پوچھا: "کس کا بچہ ہے وہ، فوراً بتاؤ"۔

"میرا بچہ ہے۔"

"کیا حرام کا بچہ ہے؟"

"نہیں مائی باپ، میری بیوی کا بچہ ہے۔"

"تیری بیوی کا بچہ ہے، تو پھر تو اس پالنے میں کیوں چھوڑ آیا ہے؟ تیری بیوی کیسی ماں ہے، اس نے تجھے اس بات کی اجازت کیسے دیدی؟"

"میری بیوی مر چکی ہے حضور، دس دن ہوئے ایک مہینہ کا بچہ چھوڑ کر مر گئی گھر میں جو کچھ تھا وہ اس کے کریا کرم میں لگ گیا۔ چھ مہینے سے میں بے کار ہوں کہیں کوئی کام نہیں ملتا۔ گھر میں پانچ بچے ہیں، یہ چھٹا ایک مہینہ کی ننھی سی جان کل رات سے بھوک سے بلک رہا تھا۔ تین دن سے گھر میں فاقہ ہے مگر کسی نہ کسی طرح ہم اس کے لئے دودھ لاتے رہے تھے۔ لیکن کل رات سے اس کے لئے دو گھونٹ دودھ بھی نہیں مل سکا، یہ کیسی دنیا ہے مالک؟ یہاں ننھے بچے کے لئے دودھ بھی نہیں ہے۔ تین دن سے میرے سب بچے میرے ساتھ فاقے کر رہے ہیں۔ وہ مر جائیں گے میں جانتا ہوں، وہ مر جائیں گے، میں بھی مر جاؤں گا۔ میں نے سوچا یہاں اس یتیم خانے میں یہ سب لوگ اس کی پرورش تو کر سکیں گے، اس لئے ایک ماہ کی اس ننھی سی جان کو پالنے میں ڈال آیا ہوں......"

"تمہیں معلوم ہے وہاں وہ کیسے رہے گا؟ اپنے ماں باپ ہوتے ہوئے بھی ساری زندگی بنا ماں باپ کا کہلائے گا۔"

"مگر زندہ تو رہے گا حولدار جی! زندہ تو رہے گا۔"

اس بڈھے نے ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

. . . . . .

آدھی رات !

پالنا خالی ہے، انسان کے دل کی طرح، انسان کی بھوک کی طرح،
میں بہت تھک گیا ہوں اور جو کچھ میں نے دیکھا ہے، اسے دیکھ کر گھر بھی
جانا نہیں چاہتا۔ میں اسی پالنے میں گر کر سو جانا چاہتا ہوں، مگر یہ پالنا
بہت چھوٹا ہے اور ہمارے گناہ بہت بڑے ہیں۔



کُتوں کے لئے
بھی فیملی
پلاننگ

Family P...

...
to...

...ment, merged by the Veter...
Department, will launch
project of castrating male
in a limited area.

کتا پلاننگ

سب سے پہلے ڈپٹی منسٹر نے فیملی پلاننگ کے منسٹر سے کہا: "آپ نے آج کا اخبار دیکھا ہے؟"

فیملی پلاننگ کے منسٹر نے ایک لمبی سی جمائی لیکر کہا: "آج کون سی تاریخ ہے؟"

"۲۴ر جنوری۔"

"گڈ گاڈ! کیسے دن گذر جاتے ہیں کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔" فیملی پلاننگ کے منسٹر نے ایک لمبا سگار اپنے منہ میں لیکر کہا: "ابھی کل ہی تو نیا سال شروع ہوا تھا کیسی عمدہ پارٹی تھی، آپ کو یاد ہوگا مسز من سکھانی کتنی خوب صورت ساڑی پہنے ہوئے تھی۔"

"آج کے 'ٹائمز' میں صفحہ سات پر ایک اہم خبر ہے۔" ڈپٹی منسٹر نے پھر یاد دلایا۔

"میں صرف وہی اخبار پڑھتا ہوں جس میں میری تقریر چھپتی ہے، اور ابھی دو دن سے میں نے کوئی تقریر نہیں کی لہذا کوئی اہم خبر بھی کیا ہو سکتی ہے؟" منسٹر

ایک طویل کش لگاتے ہوئے بولے ..

ڈپٹی نے خبر پڑھ کر سنائی "علی آباد کے مقام پر جو جام نگر سے نومیل کے فاصلے پر ہے، ایک ایسا تجربہ کیا جارہا ہے جس سے کتوں میں فیملی پلاننگ ہوسکے گی"

اس پراجیکٹ کے شروع کرنے والے چاہتے ہیں کہ کتوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کو روکا جائے کیوں کہ اس علاقے کے لوگ کتوں کو جان سے مار دینے کے حق میں نہیں ہیں۔"

محکمہ حفظان صحت میونسپل ڈیپارٹمنٹ کی مدد سے یہ پراجیکٹ شروع کرے گا، جس کے ذریعہ ایک محدود علاقے کے کتوں کو آپریشن کے ذریعہ نامرد بنادیا جائے گا۔"

"احمق"! فیملی پلاننگ کے منسٹر نے خبر سنکر کہا "انسانوں میں فیملی پلاننگ تو ٹھیک طرح سے ہو نہیں رہی، تو کتوں میں کیا ہوگی۔ بے کار میں پبلک کا روپیہ ضائع جائے گا۔"

"بالکل درست ہے"! ڈپٹی منسٹر نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا "خود میں نے یہی سوچا تھا مگر پھر خیال آیا کہ ہمارے ہاں بھی تو فیملی پلاننگ کامیاب نہیں ہے اور نئے بجٹ کے موقع پر کسی نئی کارگذاری دکھانے کی بھی ضرورت محسوس ہوگی، اسی لئے میں نے اس خبر کو اس قدر اہم سمجھا ہے۔"

ڈپٹی منسٹر چپ ہوگیا۔

"ہوں"! فیملی پلاننگ کے منسٹر ایک گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ کافی غور وخوض کے بعد بولے "خیال بُرا نہیں ہے، آخر صوبے میں کتے تو ہوں گے"

"ضرور ہوں گے"! ڈپٹی منسٹر نے کہا "گو میں نے آج تک کسی کتے کو انٹرویو نہیں دیا، انسانوں ہی سے فرصت نہیں ملتی .. .. مگر ہوں گے ضرور۔

کیا خیال ہے؟ چیف سیکریٹری سے مشورہ کیا جائے اس معاملہ میں"؟
جواب میں فیملی پلاننگ کے منسٹر نے چیف سیکریٹری کو فون کر کے اسے اپنے کمرے میں بلا لیا چیف سیکریٹری خبر پڑھ کر اور تجویز سنکر خاموش ہو گیا۔ کسی مسئلے پر رائے دینے سے پہلے وہ خاموش رہنا پسند کرتا تھا، چاہے وہ وزیروں کی عقل ہو یا کتوں کا مستقبل ہو۔
ایک لمبے سکوت کے بعد وہ بولا" کتوں سے میری ملاقات زیادہ نہیں ہے، کیوں کہ مجھے شروع ہی سے طوطے پالنے کا شوق رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس سلسلے میں اگر جائنٹ سکریٹری سے بھی مشورہ کر لیا جائے تو بہتر ہو گا۔ ان کے گھر میں پانچ کتے ہیں"۔
جب جائنٹ سیکریٹری کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی تو وہ چوکنا ہو کر کہنے لگا" صاحب جن کتوں کو میں جانتا ہوں وہ بڑے ارسٹوکریٹ قسم کے ہیں۔ میں نے ان کی دیکھ بھال کے لئے ایک ملازم رکھا ہوا ہے میرے کتے وقت پر سوتے ہیں، وقت پر جاگتے ہیں، وقت پر نہاتے ہیں، وقت پر کھانا کھاتے ہیں، وقت پر سیر کو جاتے ہیں، اپنی سوجھ بوجھ میں وہ تقریباً انسان ہیں۔ ایسے ارسٹوکریٹ کتوں کی فیملی پلاننگ پر بہت زیادہ خرچ اٹھے گا"۔
"ارے بھائی"! ڈپٹی منسٹر بولے،" ہم کوٹھیوں کے کتوں کی بات نہیں کرتے۔ ظاہر ہے انہیں کسی فیملی پلاننگ کی ضرورت نہیں ہے، چاہے وہ انسان ہوں یا کتے! لیکن اگر وہ کسی کوٹھی یا بنگلہ میں رہتے ہیں تو اس پلاننگ کی زد میں نہیں آتے۔ یہاں بات بازاری کتوں کی ہو رہی ہے۔ میرا مطلب کتوں کی عام جنتا سے ہے"۔

"میرا خیال ہے"، جوائنٹ سکریٹری بولے۔" انڈر سیکریٹری صاحب کو بلا لیا جائے۔ میں تو سول لائینز میں رہتا ہوں وہ شہر میں رہتے ہیں۔ بازاری کتوں کے بارے میں ان کی جانکاری زیادہ ہوگی۔"

انڈر سیکریٹری جب اس کانفرنس میں شریک ہوئے تو تجویز سنتے ہی اچھل پڑے۔ کیوں کہ اپنی زندگی میں کئی مرتبہ بری طرح کتوں سے پٹ چکے تھے اور ایک دفعہ حلوائی کے کتے نے انہیں اس زور سے کاٹ لیا تھا کہ ابھی تک ٹخنے کے قریب اس زخم کا نشان باقی تھا۔

"میرا اندازہ ہے اس اکیلے شہر میں دو لاکھ کتے ہوں گے اور اتنی ہی کتیا ہوں گی۔ اب اگر ایک کتیا سال میں پانچ بچے بھی دے اور ان میں سے صرف تین بچے بھی زندہ رہیں تو سمجھئے ہر سال کتوں کی تعداد دگنی ہو جاتی ہے۔ اجی صاحب! میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر اس شہر میں کتے اسی رفتار سے بڑھتے رہے تو دس سال کے عرصے میں اس شہر میں کتوں کی آبادی انسانوں کی آبادی سے زیادہ ہو جائے گی۔ ہمیں ضرور اس سلسلے میں کوئی فوری قدم اٹھانا چاہئے ذرا سوچئے تو سہی ان لاکھوں کتوں پر کتنا اناج ضائع ہوتا ہے، کتنی بیماریاں پھیلتی ہیں، کتنی سڑکیں گندی ہوتی ہیں، کتنے انسان ہائیڈروفوبیا سے مرجاتے ہیں، کتا انسان کا بدترین دشمن ہے حضور! میرا تو اندازہ ہے سرکار کہ اگر کتوں کی فیملی پلاننگ کر دی جائے تو انسان کی فیملی پلاننگ کی ضرورت ہی نہ رہے۔"

"ہیئر! ہیئر!! وزیر اعلیٰ تالی بجا کر بولے۔" میں بالکل یہی سوچ رہا تھا اور اسی خیال کے تحت میں نے تم لوگوں کو اس کانفرنس میں شریک کیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب بات بالکل واضح اور صاف ہو چکی ہے اور جیسا کہ میں نے شروع میں سوچا تھا، ہمیں فوراً کتوں کی فیملی پلاننگ کی یوجنا شروع

کر دینی چاہئے اور جیسا کہ ابھی میں نے کہا ہے کہ اگر کتوں کی فیملی پلاننگ کامیاب ہوگئی تو ہمیں انسانوں کی فیملی پلاننگ کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ آپ لوگ اس خیال کو مدنظر رکھ کر یہ یوجنا شروع کیجئے اور سب سے پہلے اس کے بارے میں ایک پمفلٹ شائع کیجئے جس کے سرورق پر ایک طرف میری تصویر ہو۔"

"اور دوسری طرف ایک کتے کی۔" ڈپٹی منسٹر نے تجویز پیش کی۔
منسٹر اعلیٰ نے گھور کر ڈپٹی منسٹر کی طرف دیکھا پھر فوراً ہی بولے "آں! ہاں، نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، صرف میری تصویر ہی کافی ہے۔"

"لیکن ایک پمفلٹ شائع کرنے سے کام نہ چلے گا۔" چیف منسٹر نے غور کرتے ہوئے کہا "اس کے لئے ہمیں بجٹ منظور کرنا پڑے گا اور نیا اسٹاف رکھنا پڑے گا۔ آخر وہی لوگ جو انسانوں کی فیملی پلاننگ کرتے ہیں، کتوں کی فیملی پلاننگ میں کام نہیں کر سکتے۔ انسانوں اور کتوں کی عادات میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے۔"

"اب کچھ ایسا بھی فرق نہیں ہوتا ہے۔" ڈپٹی منسٹر بولا۔
"نہیں، نہیں، انڈر سکریٹری ٹھیک کہتا ہے۔" منسٹر بولے۔
"ہمیں اس کے لئے بالکل نیا بجٹ اور نیا اسٹاف رکھنا پڑے گا۔ سب سے زیادہ اس امر کی ضرورت ہے کہ اس یوجنا کا انچارج ایک ایسا آدمی ہو جو کتوں کے بارے میں مکمل واقفیت رکھتا ہو۔"

انڈر سکریٹری بولا "میرا ایک بھتیجہ ہے۔"
جائنٹ سکریٹری بولا "میرا ایک بھائی ہے۔"
چیف سکریٹری بولا "میرا نواسا ہے۔"

وزیر بولا "میرا ایک داماد ہے۔"

وزیر صاحب کے بعد پھر کوئی نہیں بولا۔ وزیر نے آخری سچائی کہہ دی تھی اور سچائی کی ہمیشہ جیت ہوتی ہے ــــــ چنانچہ مجھے دوسرے دن ہی سے نوکر رکھ لیا گیا۔

(۲)

وہ لوگ بکواس کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مجھے اس لئے نوکری مل گئی کہ میں منتری کا داماد تھا۔ میں دراصل اس کام کے لئے نہایت ہی موزوں آدمی ہوں۔ ایک تو میں جانوروں کا وٹرنری ہوں۔ یعنی ڈنگر ڈاکٹر ہوں۔ جانوروں کی نفسیات کے بارے میں جتنا علم مجھے ہے اور کسی کو نہ ہوگا۔ پھر میں جانوروں کی بولی سمجھتا ہوں، اور اس زمانے میں جب کہ بیٹا باپ کی بولی نہیں سمجھتا، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کام کتنا مشکل ہے۔

دو اردلیوں، دو خلاصیوں، دو کمپاؤنڈروں اور ایک چلتی پھرتی آپریشن گاڑی سے لیس ہو کر میں نے ایک کتے کو گلی کے نکڑ پر جا گھیرا جو ایک کتیا کے پیچھے پیچھے بھاگا جا رہا تھا۔

کتے نے ہم سب کی طرف غور سے دیکھا۔ آخر وہ سمجھ گیا کہ ان سب میں سے صرف میں ہی اس سے بات کرنے کا اہل ہوں۔ لہٰذا وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں تمہارا آپریشن کرنا چاہتا ہوں" میں نے اسے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"تاکہ تم مزید بچے پیدا نہ کر سکو۔"

"ہمارے بچوں سے تمہیں کیا پریشانی ہوتی ہے؟"

"ان کے لئے ہم کھانا کہاں سے لائیں گے"۔ میں نے کتے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "اس شہر میں دو لاکھ کتے ہیں۔ اگلے پانچ سال میں دس لاکھ ہو جائیں گے ہم ان دس لاکھ کتوں کے لئے کہاں سے غذا لائیں گے۔ اپنے بچوں کا ہی پیٹ بھرنا مشکل ہو رہا ہے، اس لئے تمہارا آپریشن ہو گا، یہ بہت ضروری ہے۔"

کتے نے کہا "میں کب منع کرتا ہوں۔ اگر ہماری نسل کشی سے انسانی نسل کا مستقبل محفوظ ہے، تو کتے انسان کی خاطر یہ قربانی بھی دے دیں گے لیکن اگر ذرا غور سے میری بات سنو تو تمہیں معلوم ہو گا کہ بے کار کا بکھیڑا پال رہے ہو کتوں کو ختم کر دینے سے تمہارا کوئی لابھ نہ ہو گا۔"

"وہ کیسے؟"

"کتوں کو ختم کر دینے سے بلیوں کی تعداد بڑھ جائے گی اور تمہیں معلوم ہے بلیاں کتنی جلدی جلدی بچے دیتی ہیں؟ اور ہم لوگ تو پھر بھی تمہاری جوٹھن پر گذارا کرتے ہیں، بلیاں تو سیدھی تمہارے کچن میں گھس کر زبردستی سے دودھ پی جاتی ہیں، کچھ معلوم بھی ہے۔"

کتے نے بات معقول کہی تھی۔ چنانچہ میں نے یہ روداد اپنے ڈیپارٹمنٹ کے اعلیٰ افسروں کے سامنے رکھی، تو ان لوگوں نے آپس میں مشورہ کر کے طے کیا کہ فی الحال کتوں کی فیملی پلاننگ ملتوی کر کے بلیوں پر حملہ کیا جائے۔ چنانچہ مجھے نئے آرڈر دیئے گئے، نیا عملہ دیا گیا، نیا بجٹ منظور کیا گیا۔ جس میں سے پھر ایک نیا پمفلٹ شائع کیا گیا۔ نام تھا "بلیوں کی فیملی یوجنا۔"

آٹھ دس روز کی کوشش کے بعد ہم لوگ ایک موٹے تازے بلے کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ پہلے تو بہت دیر تک ہمیں دیکھ کر غراتا رہا اور پنجے نکال نکال کر خر خر کرتا رہا، آخر میں بے حد غصے سے مجھے گھور کر بولا۔

"میاں ہمیں جانتے نہیں ہو، میری جو بیوی ہے وہ وزیر تعلیم کی پالتو بلّی ہے اپنی نوکری چاہتے ہو تو مجھے فوراً چھوڑ دو، ورنہ شکایت کر دوں گا۔"
مجھے بھی غصہ آگیا میں نے کہا: "میاں بلّے! تم ہو کس خیال میں۔ اگر تمہاری بیوی ایک وزیر کی بلّی ہے تو میں بھی ایک وزیر کا داماد ہوں۔ میں تمہارے وزیر کا دبیل نہیں ہوں جو تم سے ڈر جاؤں گا۔"

اس پر وہ مغرور بلّا کچھ ڈھیلا پڑا، پوچھنے لگا: "آخر تم کیا چاہتے ہو؟"
اس پر میں نے اسے اپنی اسکیم سمجھائی۔ اسکیم سنکر وہ بولا: "تو تم نے انسانوں کی فیملی پلاننگ کو کتوں کی فیملی پلاننگ میں بدل دیا اور اب کتوں کی فیملی پلاننگ کو بلّیوں کی فیملی یوجنا میں بدل دینا چاہتے ہو، تاکہ اس دنیا میں بلّیاں تمہارے بچوں کی غذا نہ ہڑپ کر جائیں۔"

"بالکل ٹھیک کہتے ہو تم، یہی خیال ہمارا ہے۔" میں نے اس مغرور بلّے کو نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا: "ہم تو تمہاری جان نہیں لینا چاہتے، ہم عدم تشدد میں یقین رکھتے ہیں، اور اس آپریشن سے تمہیں کوئی خاص تکلیف بھی نہ ہوگی بس ذرا دو منٹ کے لئے تھوڑی سی تکلیف ہوگی اور اس کے بعد آٹھ دن تک تمہیں ہر روز ایک گولی کھانی ہوگی نہار منہ ناشتے سے پہلے۔"

"بہت اچھا۔" بلّا بولا: "انسانی آبادی کے محفوظ مستقبل کے لئے ہم لوگ اپنے بچوں کا مستقبل ختم کرنے کے لئے تیار ہیں، مگر بس اتنا یاد رکھو کہ اگر تم نے ہمیں ختم کر دیا تو تمہارے بچوں کا مستقبل پہلے سے زیادہ خطرے میں پڑ جائے گا۔"

"وہ کیسے؟" میں نے بلّے سے پوچھا۔
وہ بولا: "یہ سوچو کہ اگر اس دنیا میں بلیاں نہ رہیں گی تو پھر چوہوں کا

کیا ہوگا۔ آج بھی انسان کی خوراک کا چوتھا حصہ چوہے کھا جاتے ہیں اور اس کے عوض کیا دیتے ہیں تمہیں ؟ پلیگ۔ سوچو اور غور کرو اگر ہم بلّے نہ ہوں تو اکیلے اسی شہر میں ایک سال میں ایک کروڑ چوہے بڑھ جائیں"۔

"یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو" میں نے اقرار کرتے ہوئے کہا۔

"اس لئے اگر تم جانوروں ہی کی فیملی پلاننگ شروع کرنا چاہتے ہو تو چوہوں سے شروع کرو"۔

جب اس عقل مند بلّے کی بات میں نے وزیر صاحب کو سمجھائی تو فوراً کرسی سے اچھل پڑے، بولے "میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا، بالکل ٹھیک کہتا ہے وہ بلّا"۔

ایک بار پھر ہم لوگوں نے اپنی اسکیم بدل دی۔ نیا اسٹاف رکھا گیا، نیا بجٹ منظور کیا گیا، نیا پمفلٹ چھاپا گیا "چوہوں کی فیملی پلاننگ"۔

اس دفعہ ہم سب لوگ بالکل مطمئن تھے کہ اب کی ہم ٹھیک راستے پر ہیں اور اب سب کام قاعدے سے ہوگا اور جلدی ہوگا۔

مگر بہت جلد ہمیں معلوم ہو گیا کہ اس کام میں تو بہت دشواری ہے، سب سے پہلے تو ہمارا جھگڑا میونسپل کارپوریشن کے کارندوں سے ہوا، جب ہمارے عملے کے لوگ چوہے پکڑنے گئے، تاکہ ان کا آپریشن کیا جا سکے۔ تو ہمیں معلوم ہوا کہ شہر کے تمام چوہے میونسپل کارپوریشن کے قبضہ میں ہیں اور ہمارا تو ان پر کوئی حق نہیں ہے اور جب تک میونسپل کمیٹی اجازت نہ دے ہم قانونی طور پر ایک چوہے کا بھی آپریشن نہیں کر سکتے۔ اس پر ہمیں بہت غصہ آیا۔ ہمارے محکمے کے وزیر نے کارپوریشن کے میئر کو لکھا اور میئر نے محکمے کے وزیر کو لکھا۔ اس طرح کتنی مہینے گذر گئے۔ کارپوریشن والے چاہتے تھے کہ شہر کے چوہے ہمارے حوالے نہ

کئے جائیں بلکہ سیدھے سیدھے مار دیئے جائیں۔ جیسا کہ اب تک ہوتا چلا آیا تھا اور ہم چاہتے تھے کہ چوہوں کو جان سے مارنے کے بجائے ان کا آپریشن کر دیا جائے تاکہ مزید چوہے پیدا نہ ہو سکیں اور ہماری فیملی یوجنا کامیاب ہو۔

ڈیڑھ سال تک یہ جھگڑا چلتا رہا، آخر میں اوپر سے یہ فیصلہ ہوا کہ پہلے کارپوریشن چوہوں کو جان سے مار دے بعد میں وہ چوہے ہمارے حوالے کر دیئے جائیں تاکہ ہم ان کا آپریشن کر دیں۔ اوپر والوں نے دونوں محکموں کی بات رکھ لی تھی۔

مگر مردہ چوہوں کا آپریشن کرنا بے کار ہوتا۔ اس سے ہماری یوجنا خطرے میں پڑ جاتی۔ لہذا ہمارے وزیر صاحب نے مجھے بلا کر سمجھایا: "بیٹا جھگڑا کرنے سے کیا فائدہ، شہر کا میئر بھی اپنا آدمی ہے۔ یہ اس کی پرسٹیج کا معاملہ ہے اگر وہ شہر کے چوہے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے تو رکھ لے، تم دیہات میں جاؤ میں نے سنا ہے کہ گاؤں میں بھی چوہے ہوتے ہیں۔"

"ہوتے تو ہیں۔" میں نے کہا: "مگر شہر سے ڈبل ہوتے ہیں، بہت بڑے ہوتے ہیں اور بہت خطرناک ہوتے ہیں، مجھے اس کے لئے اور اسٹاف چاہیئے۔"

"اور اسٹاف بھی لے لے۔"

"گاؤں میں جانے کے لئے دو جیپیں چاہئیں۔"

"دو جیپیں بھی لے لے۔ مگر اب شہر کے چوہوں کا خیال چھوڑ دے اور دیہات کے چوہوں کی طرف رخ کر۔"

میں نے کہا: "شہر کے چوہے بڑے مہذب ہوتے ہیں، فیملی یوجنا کی بات بہت جلد ان کی سمجھ میں آ جاتی ہے مگر اب ان گنوار دیہاتی چوہوں کو سمجھانے کے لئے مجھے زیادہ پروپیگنڈہ کرنا پڑے گا۔"

"ایک اور نیا پمفلٹ چھپوالے تو۔ ان دنوں میری ایک نئی تصویر بھی

آئی ہے۔" وزیر نے مجھے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔
ایک دن جب سامان مکمل طور پر تیار ہو گیا تو ہم لوگ کیل کانٹے سے لیس ہو کر باہر دیہات میں چوہوں کی فیملی یوجنا شروع کرنے کے لئے گئے۔
مگر گاؤں والوں نے ہمیں کھیتوں کے نزدیک بھی نہ جانے دیا، وہیں سڑک کے کنارے روک دیا اور لاٹھیاں لیکر کھڑے ہو گئے۔
ان کا سردار بولا۔" چوہوں کی فیملی یوجنا؟ کیا احمق ہو، جانتے نہیں ہو کہ اگر چوہے ہمارے کھیتوں میں نہ رہیں تو ہمارے کھیتوں کی آدھی فصل کیڑے مکوڑے کھا جائیں۔ یہ تو چوہے ہیں جو دن رات ہمارے کھیتوں میں بل بنا کر ان کیڑے مکوڑوں کو کھاتے رہتے ہیں اور ہماری فصل کو تباہی سے بچاتے رہتے ہیں۔ ہم ان کی فیملی یوجنا نہ ہونے دیں گے، ہرگز ہرگز نہ ہونے دیں گے بھاگ جاؤ۔"
'عجیب مصیبت ہے' میں نے اپنے دل سے کہا۔ اگر ہم کتوں کی پلاننگ کرتے ہیں تو بلیاں بڑھ جاتی ہیں، بلیوں کی روک تھام کرتے ہیں تو چوہے بڑھ جاتے ہیں، چوہوں کو ختم کرتے ہیں تو کیڑے مکوڑے بڑھ جاتے ہیں۔ کریں تو کیا کریں؟
ہم وہاں سے تو بھاگ لئے مگر کسی کے ڈرانے دھمکانے سے بھلا ہماری فیملی یوجنا کا کام رک سکتا ہے؟ یہ تو سرکاری کام ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ ایک یوجنا نہ ہوگی تو اس کی جگہ دوسری یوجنا ہوگی۔
چنانچہ اب ہمارے محکمے کی طرف سے بہت جلد کیڑوں مکوڑوں کی فیملی یوجنا شروع ہونے والی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہمارے

مخالفین نے ابھی سے داؤ پیچ دکھانے شروع کر دیئے ہیں، محکمہ زراعت نے ایک زبردست پروٹسٹ نوٹ میں لکھا ہے کہ وہ ریشم کے کیڑوں کی فیملی یوجنا کبھی نہ ہونے دیں گے اور بہت سے سرکاری افسروں نے اس کی تائید کی ہے، غالباً یہ سوچ کر کہ سرکاری افسر بھی ایک طرح سے ریشم کے کیڑے ہی ہوتے ہیں۔

مگر بھلا کسی کے ڈرانے دھمکانے سے ہماری فیملی یوجنا کا کام رک سکتا ہے، نیا پمفلٹ چھپ رہا ہے، نیا بجٹ منظور ہو چکا ہے، نیا عملہ رکھا جا چکا ہے اور اس سال تو میں نے بھی اپنی تنخواہ خاص طور پر بڑھوالی ہے کیوں کہ میرے گھر میں خوشی ہونے والی ہے۔



ملکہ کی آمد

شیطان ٹائمز کے ایڈیٹر نے مجھ سے کہا: "تم سیدھے پالم چلے جاؤ اور ملکہ کی استقبالیہ تیاریوں کے سلسلے کی پوری رپورٹ مجھے لاکر دو۔"

شیطان ٹائمز کے دفتر میں میری ملازمت کا یہ پہلا دن تھا۔ بڑی سفارشوں کے بعد مجھے رپورٹر لیا گیا تھا۔ یہ درست ہے کہ اس سے پہلے میں نے کسی اخبار میں کام نہیں کیا تھا ــــــ!

"مگر اس سے کیا ہوتا ہے"، کالی عینک والے گنجے ایڈیٹر نے مجھے ہمدردی سے سمجھاتے ہوئے کہا: "اخبار کا رپورٹر تو پیدائشی رپورٹر ہوتا ہے۔ اس کی ناک اس قدر تیز ہوتی ہے کہ وہ جنگل میں بھی خبر سونگھ سکتا ہے۔"

میں نے خبر سونگھنے کے لئے اپنے نتھنے پھلائے۔

"عامیانہ قسم کی رپورٹنگ تو ہر رپورٹر کر سکتا ہے لیکن اگر ترقی کرنا چاہتے ہو تو دھانسو قسم کی رپورٹنگ کرو۔ اک دم سنسنی خیز، اک دم دھانسو۔" ایڈیٹر نے اپنا مکا ہوا میں لہرایا۔

جواب میں میں نے بھی اپنا مکا ہوا میں لہرایا۔
"شاباش! اب تم جا سکتے ہو" ایڈیٹر یکایک اپنی کرسی پر بیٹھ گیا جیسے اس کی ساری انرجی ختم ہو چکی ہو۔" جاتے جاتے کینٹین سے میرے لئے ایک چائے بھجواتے جاؤ۔"

میں ابھی پالم ایئرپورٹ پر پہنچا بھی نہ تھا کہ میں نے اسے پالم کے قریب کے کھیتوں میں دیکھ لیا۔ وہ ایک بہت بڑے نیم تلے کنوئیں کے قریب کھڑی اپنے بیلوں کو پانی پلا رہی تھی۔ دراز قد، گورا رنگ، شاہانہ وقار ۔۔ ۔۔ میں تو اسے دیکھتے ہی مبہوت ہو گیا اور ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگا۔ چند لمحوں کے لئے تو اس نے مجھے دیکھنے دیا پھر اس نے بیلوں کو مارنے والی سونٹی اٹھائی اور میں نے چونک کر اس سے پوچھا۔
"تمہارا نام ۔۔ ۔۔ ۔۔؟"
وہ بولی "میرا نام ملکہ ہے ۔۔ ۔۔ ۔۔!"
"ملکہ ۔۔ ۔۔ ۔۔؟"
"ہاں ملکہ ۔۔ ۔۔!"
"کتنے بچے ہیں تمہارے؟"
"تین"!
میرا دل دھڑکنے لگا، یہ وہی ہے، بالکل وہی ہے، عین سن وہی، صورت وہی، وہی وقار، وہی رعب، وہی شاہانہ انداز۔
"میں نے سامنے کے وسیع کھیتوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "کیا یہ ـــ یہ سب کھیت تمہارے ہیں؟"

"ہاں، یہ سامنے تمہیں جتنے کھیت نظر آتے ہیں ہمارے ہیں۔" وہ شاہانہ تمکنت سے بولی۔

"وہی ہے، بالکل وہی ہے۔" میرے دل نے گواہی دی اور میں فوراً ایک قدم آگے بڑھ کر اس کے سامنے دوزانو ہو گیا اور سر جھکا کر مودبانہ لہجے میں بولا۔

"ملکہ وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

"کون؟"

"دلی شہر والے۔۔ ۔۔ ۔۔ دلی شہر کے لوگ آج تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

"مگر میں تو آج تک کبھی دلی شہر نہیں گئی۔ وہاں کسی کو نہیں جانتی۔"

"دلی شہر کبھی نہیں گئیں۔۔۔ ۔۔۔ تو تو یہ بالکل وہی ہے۔۔ ۔۔ بالکل وہی ہے۔ میرے دل نے تقریباً چیخ کر مجھ سے کہا۔

"مگر میرے کھیتوں کا اناج وہاں جاتا ہے اور میرے کھیتوں کی سبزی ترکاری بھی۔" وہ خود ہی بول پڑی۔

"دلی شہر کے لوگ بڑے نمک حلال ہیں ملکہ، انہوں نے برسوں تمہارا نمک کھایا ہے۔ تمہاری روٹیاں توڑی ہیں، تمہاری سبزی ترکاری استعمال کی ہے اور آج وہ سب لوگ تمہارا سواگت کرنے کے لئے بے چین ہو رہے ہیں وزیروں سے لے کر ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تک ہر شخص تمہیں ایک پل دیکھ لینے کے لئے بے قرار ہو رہا ہے۔"

"مجھے۔۔ ۔۔ ۔۔؟" وہ ہنسی اور اس نے اپنی پتلی چھڑی اپنے موتیوں کی طرح سپید دانتوں میں داب لی اور بولی "مجھے بھلا وہ کیوں دیکھنا چاہیں گے۔"

"کیوں کہ تم ملکہ ہو۔" میں نے دونوں ہاتھوں کو زور سے پھیلا کر اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چلا کر کہا۔ "اور آج دلی تمہارے شاہانہ استقبال

کے لئے دلہن کی طرح سجی بنی کھڑی ہے۔"

اسے میری بات کا یقین آگیا۔ بیلوں کو نیم کے پیڑ سے باندھ کر بولی۔ "بچوں کو بھی لے چلوں؟"

"ہاں، ہاں۔ کیا مضائقہ ہے۔" میں نے کہا۔ "تینوں شہزادوں کو ساتھ لیتی چلو، دلی والوں کے دل میں ملکہ کے شہزادوں کے لئے بڑی عزت ہے۔"

جب ہم پالم سے پیدل چل کر دلی گیٹ پہنچے تو تینوں شہزادے بہت تھک چکے تھے۔ ایک تو تقریباً لنگڑا رہا تھا، دوسرے کو ملکہ نے اٹھا رکھا تھا، تیسرے کو میں نے اپنے کندھے پر جگہ دی تھی۔

اتفاق سے دلی گیٹ پر مجھے اپنی پہچان کا ایک اسکوٹر والا مل گیا۔ وہ ہمیں نہایت سستے داموں کناٹ پلیس لے گیا، راستے میں اروِن ہسپتال کے قریب درختوں پر رنگ برنگے قمقمے دیکھ کر شہزادے بہت خوش ہوئے۔ دونوں ہاتھوں سے تالی بجا کر بولے۔

"آباجی ---- ہم تو چمکنے والے پھل کھائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "معصوم شہزادو، یہ پھل نہیں ہیں، یہ بجلی کے دیئے ہیں جو تمہاری آمد کی خوشی میں لگائے گئے ہیں۔"

"اور یہ رنگا رنگ جھنڈیاں؟" ملکہ نے خوش ہو کر پوچھا۔

"سب آپ کے لئے ملکہ! سب آپ کے لئے ہے۔"

اروِن ہسپتال سے آگے نکلے تو رام لیلا گراؤنڈ میں لاتعداد روشنیاں تھیں، ان گنت مائیک تھے، ایک خوب صورت راجپوتنی بر رہی تھی۔

"یہ کس کے لئے؟" ملکہ نے پھر پوچھا۔

"یہ بھی آپ کے لئے۔" میں نے عرض کیا۔

آگے چلے تو کناٹ پلیس پہنچ گئے۔ کناٹ پلیس کی سج دھج دیکھ کر ملکہ بہت خوش ہوئیں۔ یونائیٹڈ کافی ہاؤس کے قریب پہنچکر فرمانے لگیں۔

"مجھے نہیں معلوم تھا دلی والے دل کے اتنے اچھے ہوں گے ورنہ میں بہت پہلے یہاں آتی۔ کئی بار میرے خاوند نے مجھ سے کہا، دلی چلو مگر میں ہمیشہ ٹال گئی۔"

"کیوں؟"

"کھیتوں میں بہت کام تھا۔" ملکہ بڑی سادگی سے بولی۔

"اور اب وہ کہاں ہے؟ تمہارا خاوند؟"

"آزادی کے فسادوں میں مارا گیا تھا۔ ان دنوں ہمارے گاؤں کے بہت سے مسلمان مار ڈالے گئے تھے کیوں کہ گاؤں کا چودھری ہماری زمینوں پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میرے خاوند کی وفات کے بعد جب وہ میرے کھیتوں پر قبضہ کرنے آیا تو میں اپنے خاوند کا کلہاڑا لیکر کھڑی ہو گئی اور بولی: "جو آگے بڑھے گا اسی کا سر سب سے پہلے کٹے گا۔"

"پھر... ؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"پھر کیا؟" ملکہ ان دنوں کو یاد کر کے سر سے پاؤں تک غصے کی آگ میں دہکنے لگی۔

میں اس کا شاہانہ جلال دیکھ کر کانپ گیا۔ پانچ فٹ دس انچ کی بھرپور توانا عورت میری طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے مجھے کچا ہی کھا جائے گی۔ خوش قسمتی سے میری گھبراہٹ دیکھ کر اس نے اپنا لہجہ بدل دیا۔ آہستہ سے بولی۔

"میرا غصہ دیکھ کر چودھری کا رنگ اڑ گیا، اور وہ سر جھکائے میرے کھیتوں سے باہر نکل گیا۔ اور یہ بالکل سچ تھا، اس وقت جو بھی آگے بڑھتا

میں اس کا سر بھٹا سا اڑا دیتی۔"

"پھر؟" میں نے کانپ کر پوچھا۔

"پھر کچھ نہیں۔" ملکہ ایک فیصلہ کن انداز میں بولی۔" وہ دن اور آج کا دن کسی نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ میں اکیلی مسلمان عورت اس گاؤں میں رہتی ہوں، اپنے کھیتوں میں ہل چلاتی ہوں، بیج بوتی ہوں فصل کاٹتی ہوں، اپنے بچوں کی پرورش کرتی ہوں، کس کی مجال ہے جو میری طرف یا میرے بچوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے، خون نہ پی جاؤں گی۔"

جن پتھ کے قریب پہنچکر شہزادوں نے منمنانا شروع کیا۔" اول اول ہمیں بھوک لگی ہے ہم ریوڑیاں کھائیں گے، ہم مونگ پھلی کھائیں گے۔"

میں نے کہا۔" اچھے شہزادے مونگ پھلی کھاتے ہیں نہ ریوڑیاں، اور پھر یہ تو نئی دلی ہے، یہاں کے لوگوں نے آپ کو اس قسم کا الم غلم کھاتے دیکھ لیا تو آپ کی عزت گھٹ جائے گی۔"

"تو ہم کیا کھائیں بھئی۔" ملکہ ذرا تنک کر بولی۔" پالم سے پیدل چلے آ رہے ہیں بھوک لگی ہے۔"

"میں نے دست بستہ عرض کی۔" راشٹرپتی بھون چلئے، وہاں تو آپ کے اعزاز میں ایک بہت بڑی دعوت دی جا رہی ہے۔"

مگر ہمیں راشٹرپتی بھون کے باہر ہی روک لیا گیا۔

"آپ کا دعوت نامہ؟" دروازے پر کھڑے ایک آفیسر نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے جیب سے دعوت نامہ نکال کر دکھا دیا۔

افسر نے کارڈ پڑھا۔ مجھے سر سے پاؤں تک دیکھ کر بولا۔" کیا شیطان نامہ

کے رپورٹر آپ ہی ہیں؟"

"جی ہاں .. .. .."!

اس افسر نے پھر مجھے غور سے دیکھا، کیونکہ میں سر سے پاؤں تک گرد و غبار میں اٹا ہوا تھا اور تقریباً یہی حالت ملکہ اور اس کے بچوں کی تھی۔

میں نے آفیسر کا شبہ دور کرتے ہوئے کہا: "میں ذرا پالم تک گیا تھا ان کو لانے کے لئے۔"

افسر نے کہا "مگر آپ کا دعوت نامہ تو صرف ایک آدمی کے لئے۔ .. .. .. اور آپ کے ساتھ تو .. .."!

"جناب والا" میں نے بڑے فخر سے کہا "بڑی حیرت کی بات ہے آپ ان لوگوں کو پہچان نہیں رہے ہیں جو میرے ساتھ ہیں .. .. آج کی دعوت ان ہی لوگوں کے اعزاز میں دی جا رہی ہے۔"

"کون ہیں یہ لوگ" آفیسر نے پوچھا۔

"یہ ملکہ ہیں — یہ ان کے تینوں شہزادے ہیں" میں نے سینہ پھلا کر کہا "دوزانو ہو جاؤ مسٹر"!

افسر نے مجھے پھر سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا، پھر وہ مڑ کر اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "میں یہاں لوگوں کو تماشا نہیں دکھانا چاہتا۔ بہتر یہی ہے کہ تم اس پگلے کو یہاں سے نکال دو۔"

(۲)

اس نے تمہیں پگلا کیوں کہا؟" ملکہ نے بعد میں مجھ سے پوچھا۔

ہم لوگ راشٹرپتی بھون سے نکالے گئے تھے اور اب پچھواڑے کے باغ سے داخل ہو کر اس سوئٹ کی طرف جا رہے تھے جہاں ملکہ اور ان کے

عملے قبیلے کے لئے ٹھہرنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔

"وہ خود پاگل تھا،" میں نے ملکہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا: "اس نے تمہیں نہیں پہچانا۔ اگر پہچان لیتا تو فوراً دونا ہو جاتا کیوں کہ ہم لوگوں نے تمہارے کھیتوں کا اناج کھایا ہے، وزیروں سے لے کر دکانداروں تک ہم سب لوگ تمہاری محنت سے زندہ ہیں۔ ہم بڑے نمک حلال لوگ ہیں ملکہ، مگر مجھے بڑا افسوس ہے اس آفیسر نے تمہیں نہیں پہچانا۔"

ایک شہزادہ بولا: "مجھے بھوک لگی ہے۔"

دوسرا بولا: "مجھے نیند آرہی ہے۔"

ملکہ بولی: "اب میں تھک گئی ہوں۔"

میں نے کہا: "ملکہ جہاں تمہیں میں اب لے جا رہا ہوں وہاں کسی طرح کی غلطی نہیں ہو سکتی۔ وہاں سب لوگ تمہیں پہچانتے ہیں۔ وہاں تمہیں کھانے کو بڑھیا سے بڑھیا ملے گا۔ سونے کے لئے شاہانہ بستر، درجنوں نوکر خدمت کرنے کے لئے۔ راشٹرپتی بھون کا یہ حصہ صرف تمہارے لئے ریزرو کیا گیا ہے۔"

ملکہ نے یہ سنکر تبسم فرمایا اور پھر ملکہ اور شہزادوں کے قدم تیز ہوتے گئے، ستونوں کی آڑ لیتے ہوئے، غلام گردشوں کے کونوں میں چھپتے ہوئے ہم کسی نہ کسی طرح اس سوئٹ میں پہنچ گئے جو ملکہ کے لئے وقف تھا۔ کیسی خوب صورت دیواریں تھیں، کیسی منقش چھتیں تھیں، کتنے حسین فانوس تھے، کتنے بڑھیا اسپرنگ دار بستر تھے۔ شہزادے بستر سے چھلانگیں لگاتے اور نیچے گرتے، غالیچوں پر گر کر لوٹ پوٹ ہوئے جاتے تھے۔

ملکہ بھی اپنے شفاف جھلملاتے بستر پر لیٹ گئیں۔ پھر اس نے ایک

دل کش ادا سے انگڑائی لی۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر قریب کی تپائی پر رکھی ہوئی چاندی کی ایک فروٹ باؤل میں ہاتھ ڈالا۔

اس فروٹ باؤل میں چمن کے انگور تھے، کابل کے سردے، بمبئی کے الفانزو، عظیم آباد کی لیچی، کشمیر کے سیب، کلو کی ناشپاتیاں، پشاور کے مالٹے، قندھار کے انار، ناگپور کے سنگترے، انگلینڈ کے آڑو، ویلز کے اخروٹ اور اسکاٹ لینڈ کی گھاس تھی۔ غرضیکہ ہر موسم اور ہر جگہ کا پھل اور میوہ تھا۔

ملکہ نے انگور کا ایک دانہ منہ میں رکھ کر کہا: "یہ دلی والے کتنے اچھے لوگ ہیں۔"

یکایک سامنے کا پردا ہلا اور ایک معمر بٹلر نمودار ہوا اور "یور میجسٹی" کہہ کر جھکا۔ پھر جو اس نے ملکہ اور اس کے بچوں کو دیکھا تو وہ جھکنے کا جھکا رہ گیا، اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

پھر اس کے پیچھے دو یورپین خادمائیں نمودار ہوئیں جنہیں دیکھ کر انہوں نے زور سے ایک چیخ ماری اور فوراً بیہوش ہو گئیں ــــ!

(۳)

ہم لوگ وہاں سے بھی نکالے گئے لیکن گرفتار نہیں کیے گئے، وجہ صاف ظاہر ہے، وہ لوگ کسی قسم کا ہنگامہ نہیں چاہتے تھے۔ مگر اب میں بے حد خفا تھا، آخر یہ کس طرح کی سازش ہے؟ آخر یہ سب لوگ ملکہ کو پہچاننے سے کیوں انکار کر رہے ہیں؟

میں شیطان ٹائمز کا رپورٹر تھا، یہ درست ہے کہ مجھے آج ہی نوکر رکھا گیا ہے، مگر ایک جرنلسٹ آخر جرنلسٹ ہے۔ چاہے اس کی ایک

دن کی سروس ہو یا دس برس کی ! اور ایک جرنلسٹ کی عزت اس امر کی متقاضی ہے کہ میں ملکہ کے خلاف اس سازش کو اپنے اخبار میں بے نقاب کر دوں۔ اگر ایک دفعہ ملکہ کو پریس نے پہچان لیا تو پھر ساری دنیا کو اسے پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ پریس کی طاقت بہت بڑی طاقت ہے۔

یہ سوچ کر میں ملکہ اور اس کے تینوں شہزادوں کو لیکر ایک اسکوٹر میں بیٹھ کر شیطان ٹائمز کے دفتر کو روانہ ہو گیا۔

(۴)

شیطان ٹائمز کے ایڈیٹر نے مجھ سے پوچھا: پالم گئے تھے؟"

"جی ہاں" میں نے کامل اعتماد سے کہا۔

"پھر؟ ملکہ کو دیکھا؟"

"دیکھا کیا؟ میں اسے اپنے ساتھ لایا ہوں"!

"اپنے ساتھ؟ یہاں"؟ شیطان ٹائمز کا ایڈیٹر تقریباً چیخکر بولا۔

"جی ہاں" میں نے فخر سے سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔

"یہاں؟ ہمارے دفتر میں؟ ناممکن"! چیف ایڈیٹر کرسی سے اٹھ کر بولا۔

"یقین نہ آئے تو باہر رسپشن لاج میں جا کر دیکھ لو" میں نے کامل بھروسے سے کہا۔

"او مائی گاڈ"! شیطان ٹائمز کا ایڈیٹر گلا پھاڑ کر بولا "یہ دنیا کی سب سے بڑی، سب سے دھانسو خبر ہے۔ Greatest Scoop on earth. میں تمہیں آج سے پانچسو روپے کی ترقی دیتا ہوں تمہیں اپنا اسسٹنٹ ایڈیٹر نہیں، نیوز ایڈیٹر، نہیں، جائنٹ، چیف ایڈیٹر مقرر کرتا ہوں! میری غیر حاضری میں تم میری کرسی پر بھی بیٹھ

سکتے ہو، ایڈیٹوریل لکھ سکتے ہو۔" شیطان ٹائمز کے ایڈیٹر نے فرطِ مسرت سے مجھے گلے لگا لیا اور میرا منہ چومتے ہوئے بولا "چلو چلو! مجھے ملکہ دکھاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ میرا انتظار کئے بغیر باہر ریسپشن روم کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا چلا گیا، ریسپشن روم کے اندر جا کر وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا اور چاروں طرف غور سے دیکھنے لگا۔ لیکن اسے کہیں پر ملکہ نظر نہ آئی۔ اسے ایک کسان عورت نظر آئی جو اپنے پھٹے لہنگے سے جوئیں چن رہی تھی اور جس کے قریب اس کے تین بچے ننگ دھڑنگ بیٹھے تھے۔

"کہاں ہے ملکہ؟" اس نے چلا کر مجھ سے پوچھا۔

میں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا، "یہ کیا ہے؟"

"یہ ملکہ ہے؟" وہ غصے سے چلا کر بولا۔

"بالکل وہی ہے، اس کا نام ملکہ ہے اور پالم میں رہتی ہے اور وہیں تم نے مجھے ملکہ سے ملنے کے لئے بھیجا تھا——!"

"ابے احمق!" ایڈیٹر نے اپنا سر پیٹ کر کہا۔ "میں نے تمہیں اس جوئیں چننے والی ملکہ سے نہیں اس باہر والی ملکہ کے استقبال کے لئے بھیجا تھا جو انگلینڈ سے آ رہی ہے۔۔۔۔!"

"تو تم نے مجھے پہلے بتا دیا ہوتا۔" میں نے آزردہ ہو کر کہا۔ "اب مجھے کیا معلوم تھا؟"

"ابے گدھے!" ایڈیٹر میرا گلا پکڑتے ہوئے بولا۔ "کیا تجھے اتنی تمیز نہیں ہے کہ دلی والے اس کھیتوں والی ملکہ کا سواگت کریں گے جس کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں، جس کے بچوں کے تن پر صرف ایک لنگوٹی ہے اور پاؤں ننگے اور زخمی ہیں، پیٹ بھوکا ہے اور سر ننگا ہے۔ کیا اس گنوار اور

بے وقوف کسان عورت کے سواگت کے لئے جنتا کا دو کروڑ روپیہ برباد کیا جارہا ہے"۔

"یہ گنوار اور بے وقوف عورت نہیں ہے" میں نے شیطان ٹائمز کے ایڈیٹر کو پرے دھکیلتے ہوئے کہا۔ کیونکہ اب مجھے بھی غصہ آرہا تھا: "یہ بڑی بہادر، سورما اور شیرنی ہے۔ اس اکیلی عورت نے دشمنوں کے خلاف لڑکر اپنے بچوں اور اپنے خاوند کے کھیتوں کو بچایا ہے ۔۔ ۔ ۔ اس کی شکل وصورت دیکھو کسی طرح سے بھی یہ تمہاری ملکہ سے کم نہیں ہے ۔۔ ۔ ۔ تمہاری ملکہ اگر دن میں آٹھ گھنٹے کام کرتی ہے تو یہ دن میں بارہ گھنٹے کام کرتی ہے، تمہاری ملکہ اگر اپنی سلطنت چلاتی ہے تو یہ بھی اپنے کھیت سنبھالتی ہے اور کسی وزیر کی مدد کے بغیر سنبھالتی ہے، اگر تمہاری ملکہ اپنے بچوں سے محبت کرتی ہے تو یہ تو اپنے بچوں پر جان چھڑکتی ہے۔ پھر اس کے کپڑے پھٹے ہوئے کیوں ہیں؟ اس کے بچے بھوکے کیوں ہیں؟ اور تم لوگ اس کے کھیتوں کا اناج کھا کر اس کا نمک کیوں حرام کرتے ہو؟ دور ہو جاؤ مسٹر اور اپنی ملکہ کو سلام کرو۔"

چیف ایڈیٹر دانت پیسنے لگا، اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا، وہ چیخ کر بولا "گیٹ آوٹ"!

(۵)

ملکہ اسی رات اپنے تینوں بچوں کو لیکر واپس پالم چلی گئی ۔۔۔ کبھی کبھی میں اس کے کھیتوں میں جاتا ہوں اور اس سے پوچھتا ہوں" ملکہ ہمارے شہر میں کب آؤ گی"؟ وہ میرا سوال سنکر مسکرا دیتی ہے، اس کی نگاہیں زمین سے اٹھ کر آسمان پر چلی جاتی ہیں اور وہ خوابیدہ نظروں سے دور افق کے پار دیکھتے ہوئے کہتی ہے۔

"میں آؤں گی، جب تمہارے شہر والے مجھے پہچان جائیں گے"!

Unseasonal "Holi" In Chandni Chowk

By A Staff Reporter

چاندنی چوک میں بے موسم کی ہولی

In Chandni Chowk on Monday morning a lean man with a ... low handkerchief tied round h... head fumbled in the pocket... khadi kurta. He ... of matches ... a ...

The cele... prob...

...ing ...vocation to ...old-fashioned ...ing of doc...

the lean ...handkerchief ... his eye...

...volunteers ... demand the ... ng ... all obscene literature, the ... figures ... communally frightened ... took to a disorderly flight

Curious spectators many of whom were mystified by the quaint ceremony formed a circle ... round the bonfire. Children on their way to school stopped to ... a couple of ...

Holi ... of ... make ... "Ce... the bon... obscene ... Some ... female face... activities were ... as a Hindu bride ... Radha and Krishna ... mond ... figures ...

books in Hindi and Urdu ... however cheap and dirty.

When the attention of a Sarvodaya worker was drawn to the ... innocuous posters in the pile, he said: "These have been donated to us by people who regarded them as obscene." Obscenity obviously is liable to varying interpretations.

The bonfire—the first of its kind in Delhi since the Sarvodaya Mandal launched its anti obscenity campaign in May last—was arranged as part of the celebrations of Acharya Vinoba Bhave's Jayanti.

... era ... ask ... are to the bon...

... pile was burnt up in ... As the wind scattered the ashes on the pavement, which had been cleaned only an hour earlier, the Sarvodaya men retired to have a simple breakfast in the Town Hall.

The driver of the ... engaged watched the proceedings with puzzlement and asked: "What is all this 'tamasha' about?" I did not have the heart to explain.

گنداان

"کیوں جی! آپ کے گھر میں کوئی گندی کتاب ہے؟" ڈیوڑھی میں سے آواز آئی، تو سروج چولھے پر سے روٹیاں اتارتے اتارتے جلدی سے ڈیوڑھی میں چلی آئی اور میرے ساتھ ایک دبلے پتلے کھدر دھاری بھگت جی کو دیکھ کر جھینپ گئی۔ ہم بھی اسے دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے جھینپ گئے کیوں کہ سروج اس وقت بالکل عجیب حالت میں تھی۔ دوپٹہ سر پر نہ تھا، بال بکھرے ہوئے تھے، سینہ ابھرا ہوا تھا، وہ ایک پھٹی ہوئی قمیض پہنے ہوئے تھی جس میں سے اس کا خوب صورت جسم جگہ جگہ سے جھانک رہا تھا۔ پہلی نظر میں ہمیں وہ بالکل کسی ہندوستانی فلم کا اشتہار معلوم ہوئی۔

کھدر دھاری بھگت جی نے ہات جوڑ کر نمسکار کرتے ہوئے بڑے نرم لہجے سے کہا "بہن جی! آپ کے گھر میں اگر کوئی گندی کتاب ہو تو ہمیں دان دے دیجئے۔"

سروج نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ میں نے نڈر ہو کر کہا "بھگت جی!

اگر بہن سروج کے گھر میں گندی کتابیں نہ ملیں گی تو کہاں ملیں گی ؟ اس کا گھر والا گندی کتابیں چھاپنے کا ہی دھندا کرتا ہے ۔"

"چھی چھی بہت بری بات ہے"! بھگت جی سروج کی طرف افسوس سے دیکھ کر بولے۔

سروج نے جھنک کر کہا۔ "گندی کتابیں نہ چھاپیں تو کیا کریں ؟ کوئی اور کام جب نہ ملے تو کیا بھوکے مر جائیں ؟ اسی سے پوچھو ۔ ۔ ۔ " سروج نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرے گھر والے نے کام کے لئے کہاں کہاں کوشش نہیں کی ۔ میونسپلٹی میں ، سکریٹریٹ میں ۔ فرموں میں ۔ ٹھیکے داروں کے یہاں ، دوکانوں پر ۔ کہاں کہاں ٹکریں نہیں ماریں ؟ جب کام نہ ملے تو کیا اپنے تینوں بچوں کو بھوکا مار دیں ؟"

میں نے کہا۔ "انہیں فلمی پوسٹر کھلایا کرو ، اس میں ہر طرح کے وٹامن ہوتے ہیں ۔"

"آنے دو ان کو۔" سروج میرے سامنے ہوا میں مکا گھماتے ہوئے بولی "معلوم ہوتا ہے تم نے اب کوکین کا دھندا چھوڑ کر سرکار کی مخبری شروع کر دی ہے ۔"

"تم ہمیں غلط سمجھ رہی ہو بہن ۔" بھگت جی نے بے حد نرمی سے کہا۔ "ہم سرکاری آدمی نہیں ہیں ، ہم تو سردوے کے کارکن ہیں ، آپ کے سیوک ہیں ۔"

"جی ہاں !" میں نے ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "اس سے پہلے ہم گندی اور بنجر زمینیں جمع کرتے تھے ، آجکل گندی اور عریاں کتابیں جمع کرتے ہیں ۔ اگر آپ اپنے گھر سے کچھ گندی کتابیں دان میں دیں گی تو ہم انہیں لیکر فوراً جائیں گے ۔"

سروج نے گھور کر میری طرف دیکھا اور اس طرح غصہ سے دیکھا جس طرح

فلم ایک دو تین میں بینا شوری موتی لال کی طرف دیکھتی ہے۔ پھر وہ پلٹ کر جلدی سے اندر چلی گئی اور الٹے پاؤں واپس لوٹ کر کچھ کتابیں ہمارے سامنے پٹک کر غصے سے پھنکارتی ہوئی واپس چلی گئی۔

میں کتابیں اٹھا کر انہیں باری باری دیکھنے لگا: "اصلی کوک شاستر باتصویر واہ واہ! اسے تو میں ضرور پڑھوں گا۔"

بھگت جی نے جلدی سے وہ کتاب مجھ سے چھین لی۔

میں دوسری کتاب دیکھنے لگا: "کام سوتر، لیکھک واتسیاین۔ اچھا میرا خیال اب تک یہی تھا کہ واتسیاین جی صرف پرلوگ وادی کویتا کرتے ہوں گے، یہ حضرت تو بڑے چھپے ہوئے رستم نکلے۔"

بھگت جی نے ڈانٹ کر مجھ سے کہا: "احمق ہوئے ہو وہ واتسیاین اور تھے یہ واتسیاین اور ہیں یہ کام سوتر تو ہزار برس پرانی کتاب ہے۔"

"تو کیا یہ کتاب بھی گندی ہے؟"

"گندی کتاب تو گندی کتاب ہے، چاہے وہ کسی زمانے میں لکھی جائے۔"

"مگر میں نے سنا ہے بھگت جی! کہ کام سوتر تو سیکس کے بارے میں لکھی گئی ہے اور یہ ایک گیان کی کتاب ہے، وگیان کی پستک ہے، یعنی جہاں تک اس زمانے کی سائنس سیکس کے بارے میں سوچ سکتی تھی۔"

"مگر ہے تو سیکس کے بارے میں، اس لئے گندی ہے۔" بھگت جی نے وہ کتاب بھی مجھ سے چھین لی۔

تیسری کتاب پر ایک نیم عریاں عورت کی رنگین تصویر بنی تھی جو ایک باتھ ٹب میں نہا رہی تھی۔ کتاب کا نام تھا "غسل خانے کی محبوبہ"۔

"چھی چھی"! میں نے جلدی سے کتاب کو بھگت جی کے حوالے کر دیا

بھگت جی کتاب کی تصویر دیکھ کر بولے" ایسی تصویریں دیکھ کر ہی تو ہمارے دیس کے نوجوانوں کا کیریکٹر خراب ہوتا ہے"

"چلئے یہاں سے چلیں"۔ میں نے بھگت جی سے کہا۔

مگر بھگت جی تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے بولے" دیکھئے تو کتنی گندی ہے ۔۔ ۔۔ کتنی گندی تصویر آرٹسٹ نے بنائی ہے۔ عورت کے بال کھلے ہیں"

"شاید سر دھونے جا رہی ہو"

"اجی نہیں، بال ہی کھلے نہیں ہیں۔ ساری یا نہیں کھلی ہیں، گلا ننگا ہے"

"اجی چھوڑیئے" میں نے کہا۔

"چھاتیاں ننگی ہیں، پیٹ ننگا ہے" بھگت جی تصویر کے ایک ایک حصے کو دھیان سے دیکھتے ہوئے بولے" بڑی گندی تصویر ہے"

"اسے جھولے میں ڈالئے اور آگے چلئے۔ ابھی تین گھر اور باقی ہیں"۔ میں نے بھگت جی کے ہات سے کتاب لیکر دان کے جھولے میں ڈال دی اور ان کو ساتھ لیکر باہر نکل آیا۔

بھگت پھپھوندی رام نے اپنے سچے اور خوب صورت کردار سے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں اپنا جما جمایا کاروبار چھوڑ کر سروودے اندولن میں شامل ہو گیا۔ پہلے ہم لوگ بھومی دان کا کام کرتے تھے۔ اس میں جنتا نے ہمارے ساتھ بہت تعاون کیا۔ کچھ ہی سال میں ہمیں لاکھوں ایکڑ زمین دان میں مل گئی۔ مگر بعد میں جب جانچ پڑتال کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس میں سے زیادہ تر زمین بنجر اور بے کار تھی۔ دان دینے والوں کی اخلاقی گراوٹ پر ہمیں بہت دکھ ہوا، اس سے ہمارے من میں یہ خیال پیدا ہوا کہ دیش اور

وقت تک ترقی کے راستے پر آگے نہیں بڑھ سکتا جب تک یہاں کے لوگوں کے شعور کی اخلاقی سطح اونچی نہ کی جائے۔ اس کے لئے ایک طرف سرکار نے نشہ بندی شروع کر دی۔ دوسری طرف ہم نے فلمی پوسٹر پھاڑنے شروع کر دیئے اور اب ہم لوگ گلی گلی محلے محلے جا کر گندی کتابیں جمع کر رہے تھے۔ آج میں بھگت پھپھوندی رام کو اپنے محلے میں لے آیا تھا۔

دوسرا گھر جہاں میں بھگت پھپھوندی رام کو لے گیا وہ لالہ ٹھاکر داس کا تھا۔ لالہ ٹھاکر داس چاندنی چوک کے مشہور جوہری تھے۔ ایک زمانہ میں دلی کی ساری مشہور طوائفیں ان کے یہاں سے اپنا زیور خریدتی تھیں۔ مگر جب سے دلی میں طوائفیت بند ہوئی تھی لالہ ٹھاکر داس کا کاروبار کچھ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ آج کل وہ اپنی دکان پر زیورات کے علاوہ ولائتی ناولٹی کا سامان بھی بیچتے تھے اور طوائفوں کا وہی زیور سستے داموں پر خرید رہے تھے جسے انہوں نے کبھی مہنگے داموں بیچا تھا۔ لالہ ٹھاکر داس کرشن بھگت تھے، دن میں دو بار مندر جاتے تھے اور اپنی تینوں عورتوں کے گھر ہر سال میں تین بار کتھا کہلواتے تھے۔ انہوں نے ہمارے اندولن کو چلانے کے لئے دل کھول کر چندہ دیا تھا۔ اس وقت ہم ان کے گھر ان کا شکریہ ادا کرنے گئے تھے۔ مگر میں داد دیتا ہوں بھگت جی کی اور ان کے اونچے اخلاقی شعور کی کہ بھگت پھپھوندی رام اپنے بھگت کے گھر جا کر بھی اپنے فرض سے نہیں چوکے۔ انہوں نے چلتے وقت دیوار پر ٹنگے ہوئے ایک بڑے کیلنڈر پر انگلی رکھتے ہوئے لالہ ٹھاکر داس سے کہا "یہ کیا ہے؟"

"کیلنڈر ہے۔"

"مگر کس کا کیلنڈر ہے؟"

"رادھا کرشن کا کیلنڈر ہے۔" لالہ ٹھاکر داس نے جواب دیا۔

"کیا رادھا اسی طرح ادھ ننگی رہتی تھیں؟" بھگت پھپھوندی رام نے غصے سے پوچھا۔ "پتلے کپڑے کے اندر سے انگ انگ جھانکتا رہا ہے۔"

"ممکن ہے اس زمانے میں نائی لون ایجاد ہو چکا ہو۔" میں نے کہا۔

"تم چپ رہو۔" بھگت جی غصے سے بولے۔ "اور آرٹسٹ نے کرشن کو کیسے پیش کیا ہے۔ دیکھئے تو اس کرشن کی نگاہ میں کیسی بے حیائی اور آوارگی ہے۔ یہ رادھا کو کیسی بری نگاہوں سے تک رہے ہیں۔"

میں نے کہا "ممکن ہے جسے آپ بے حیائی اور آوارگی سمجھ بیٹھے ہوں وہ صرف محبت ہو۔"

"نہیں، یہ گندا کیلنڈر ہے۔" بھگت جی نے دیوار پر لٹکا ہوا کیلنڈر کھینچ کر اپنے جھولے میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "مجھے حیرت ہے لالہ ٹھاکر داس جی!"

لالہ ٹھاکر داس تھر تھر کانپنے لگے۔ گھگھیاتے ہوئے بولے۔ "بھگت پھپھوندی رام جی! مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے بھول ہوئی۔ اصل میں میں نے اس کیلنڈر کو کبھی غور سے دیکھا ہی نہیں۔ میں اسے ہمیشہ رادھا کرشن کا ایک خوب صورت کیلنڈر سمجھتا رہا۔"

"معاف کر دیجئے بھگت جی!" میں نے سفارش کرتے ہوئے کہا۔ "اس بے چارے کے دماغ کو شاید پھپھوندی لگ گئی تھی۔"

بھگت جی نے مجھے غصے سے گھورا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ باہر گلی میں جا کر پوچھنے لگے۔ "اب کہاں چلنا ہوگا؟"

میں نے کہا۔ "اب تو ایک ہی گھر باقی رہ گیا ہے جہاں سے ہمیں کچھ مل سکتا ہے۔"

"کون سا گھر ہے۔ وہ"؟

"وہ اس محلے کا سب سے غریب گھر ہے۔ وہاں ایک بڑھیا اپنے بیٹے کے ساتھ رہتی ہے۔ بیٹا سینما کے اشتہار دیواروں پر چپکانے کا کام کرتا ہے"۔

"تو اس کے گھر ضرور چلنا چاہیئے" بھگت جی خوش ہو کر بولے۔

"اس کا نام گوتم ہے مگر وہ ایک ہی سر پھرا اور باغی ہے۔ میرے خیال میں تو ہمیں اس کے گھر نہیں جانا چاہیئے"۔

"واہ جہاں سب سے زیادہ گندے پوسٹر نکلنے کی امید ہے وہاں نہ جائیں یہ کیسے ہو سکتا ہے"۔ بھگت جی بولے اور میں سر جھکا کر ان کے ساتھ ہو لیا۔

راستے میں ایک پبلک نل کے نیچے ایک نوجوان عورت نہاتی ہوئی مل گئی۔ اس کی بھیگی دھوتی اس کے گورے جسم سے بالکل چپک گئی تھی اور وہ بے چاری ہمیں دیکھ کر ہی شرما گئی۔ اس نے جلدی سے اپنا منہ موڑ لیا۔ ایسا کرنے سے ہمیں اس کے جسم کی دوسری دل کش گولائیاں بھی نظر آ گئیں جو اب تک نظر سے اوجھل تھیں۔

میں نے کہا" بالکل غسل خانے کی محبوبہ کا پوز ہے"۔

بھگت جی بولے" آخر یہ عورت گھر پر کیوں نہیں نہاتی"۔؟

میں نے کہا" اس لئے کہ ہمارے گھروں میں اکثر غسل خانے نہیں ہوتے کہیں کہیں تو نلکا بھی نہیں ہے، اس حالت میں لوگ کیا کریں"؟

"چلو چلو، آگے چلو"۔

"میرے خیال میں اس ننگی عورت کو ضرور سمجھانا چاہیئے۔ آخر یہ کیوں پبلک نل کے نیچے نہا رہی ہے"؟

"چلو چلو، آگے چلو"۔ بھگت جی جلدی سے آگے بڑھ گئے۔

جب گوتم کے گھر جا کر بھگت جی نے اپنے آنے کا مقصد بتایا تو گوتم بھڑک اٹھا۔

"میں گندے فلمی پوسٹر بناتا نہیں صرف انہیں دیوار پر چپکاتا ہوں۔"

بھگت جی بولے: "برے کام میں مدد دینا بھی برا ہے، اس سے سماج میں گندگی پھیلتی ہے۔"

"سماج میں اور جن باتوں سے گندگی پھیلتی ہے انہیں دور کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟" گوتم غصہ ہو کر بولا۔ "سماج میں جن گندے اصولوں سے بھوک، بے کاری، غریبی بڑھتی ہے۔ وہ تمہاری نظر میں کیوں نہیں آتے؟ صرف فلمی پوسٹر پھاڑنے سے کیا ہوگا؟ بداخلاقی، بدمعاشی، بلیک مارکیٹ کا اتنا بڑا گندہ پوسٹر جو سماج کے منہ پر چپکا ہوا ہے۔ اسے پھاڑنے کی ہمت کیوں نہیں کرتے بھگت جی! ہولی کھیلو تو ایسی، جس میں اس دیش کی رشوت خوری، کنبہ پروری، جات پات کی لعنت، چوری چکاری اور منافع خوری، ساری کی ساری جل کر راکھ ہو جائیں۔ ایسا کر سکو بھگت جی، تو میرے گھر سے سارے فلمی پوسٹر اٹھا لے جاؤ بلکہ میری جان کی بھی ہولی کھیلو، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"ہیئر ہیئر!" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "بھگت جی! لڑکا ٹھیک کہتا ہے۔ اسے آندولن میں شامل کر لو۔"

"جی نہیں، بالکل احمق اور سر پھرا ہے۔" بھگت جی غصہ ہو کر بولے "چلو یہاں سے چلیں۔"

چاندنی چوک میں ہم لوگوں نے بڑی شان سے گندی کتابوں، گندے کیلنڈروں اور گندے فلمی پوسٹروں کو جلا کر نئی ہولی منائی۔ راہ چلتے

سیکڑوں لوگ اکٹھے ہو گئے۔ بھگت جی نے موقع دیکھ کر اپنا اپدیش شروع کر دیا۔

جب بھگت جی اپنا اپدیش دے رہے تھے اس وقت میں جلدی جلدی سے کیلنڈروں، فلمی پوسٹروں اور کتابوں میں سے 'غسل خانے کی محبوبہ' تلاش کرنے لگا۔

مگر اور سب کتابیں تو مجھے وہاں مل گئیں بس وہی ایک کتاب مجھے نہیں ملی۔ ہار کر میں نے سارے ڈھیر پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔

کتابیں جل رہی تھیں، بھگت جی اپدیش دے رہے تھے اور میں ان کے کھدر کے سفید جبوے کو دیکھ رہا تھا جس کے اندر مجھے ایک کتاب ہلتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔



۲۰۰ برس

پرانا

قرض

چکایا

200-YEAR-OLD CLAIM PA...

LONDON

Chancell...
der
says

Th... ...an Treas... cently received a... from the Rev. Jos... of the 200-year-o... Episcopal Church, who claimed that ... had torn down the ... in 1778 and had used ... firewood.

The actual damage ... $18 but Mr Koci added an extra $760,000 as compound interest at six per cent spread over 183 years...

The Chancellor's letter ... by his private secr... ... Carey said ... of the Exchequer ... that the alleged d... to have occurred be... of Versailles in 178... vania was at that ... colonial territory

...ion as that claims ... colonial territories ... vernment, which ... tled by the data ... lie against the ... ent unless a ... is made to

... arrangement ... fore I am ... hould ... the ... USA ... of ... pre-

... the ... ve

Cha... Majo... orig... for...

... by ... the fund ... d as a token ... for the Americ...

پرانا قرضہ

آج سے دوسو سال پہلے انگریزی فوجوں نے امریکہ کی آزادی کی لڑائی کے دنوں میں فلے ڈیلفیا کے ایک گرجا گھر کی عمارت کو نقصان پہنچایا تھا۔ اس سلسلے میں کچھ مہینے ہوئے اسی گرجا گھر کے پادری جوزف کوسی نے انگلینڈ سے ہرجانے کی رقم طلب کرلی۔ دوسو سال کے بعد! ...... انگلینڈ کے چانسلر آف ایکسچیکر نے اس گرجے کے پادری کو ایک بہت اچھا خط لکھا اور ہرجانے کے طور پر چھ پونڈ آٹھ شلنگ اور ایک پنس کی رقم ادا کی۔

یہ خط دنیا کے تمام اخباروں میں چھپ چکا ہے اور دنیا کے چاروں کونوں میں انگریزوں کی سچائی اور فیصلہ کی دھوم مچ گئی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس دنیا میں جب کہ بھائی بھائی کا قرضہ ادا نہیں کرتا، آج بھی ایک قوم ایسی ہے جو اپنا قرضہ پائی پائی کرکے چکا دیتی ہے — اور وہ ہے انگریز قوم۔

دوسو سال پرانا قرضہ چکا کر انگریزی چانسلر نے انگریزی شرافت کی ایسی مثال قائم کی ہے جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ ہندوستان میں انگریز چانسلر

آف ایکسچیکر کے خط کا بہت کافی اثر ہوا ہے اور سب سے زیادہ اثر مجھ پر ہوا ہے جب میں نے اخباروں میں یہ خط پڑھا تو میں انگریزی حکومت کی انسانی محبت اور شریف عادات کا قائل ہو گیا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں دو گھنٹے تک روتا رہا۔ پھر میں آنسو پونچھ کر اپنی گندی کھولی سے باہر نکلا اور اخبار سے یہ خبر کاٹ کر کچھ لوگوں سے ملنے چلا گیا۔ ان ملاقاتوں کا نتیجہ اب تک یہ نکلا ہے کہ صرف ہمارے ملک ہندوستان سے سینکڑوں لوگوں نے انگریزی وزیر کو مبارکباد کے خط لکھے ہیں۔ یہ خط دنیا کے کسی اخبار میں نہیں چھپے ہیں۔ یہ خط پہلی بار آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ جگہ کی کمی کی وجہ سے سارے خط تو نہیں چھاپے جا سکتے نمونہ کے طور پر صرف کچھ خط پیش کرتا ہوں۔

"پہلا خط"

پانڈے شمبھو چن شرما کی طرف سے، چانسلر آف ایکسچیکر کے نام!

جے رام جی کی!

آج سے دو سو سال پہلے انگریزوں نے فلے ڈلیفیا کے ایک گرجا گھر کی عمارت کو جو نقصان پہنچایا تھا، اس کے لئے آپ نے چھ پونڈ آٹھ شلنگ ایک پنس کا ہرجانہ ادا کر کے جو قدم اٹھایا ہے، اس کے لئے میں آپ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے اسی طرح انگریزی فوجوں نے لڑائی لڑتے ہوئے میرے پرکھوں کے دو مندروں کو نقصان پہنچایا تھا۔ انگریزی فوجوں کی گولہ باری سے ہمارا ایک مندر تو بالکل ٹوٹ گیا تھا اور دوسرے کی چار دیواری گر گئی تھی۔ اس زمانے کے تحصیلدار نے نقصان کا اندازہ دو لاکھ روپے لگایا تھا۔ مہربانی کر کے یہ رقم جلد سے جلد بھیجنے کی تکلیف کیجئے۔ نقصان کا تخمینہ تحصیلدار بنارس کے تحریری ثبوت کے ساتھ آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔

"دوسرا خط"

مولانا صلاح الدین کی طرف سے، لارڈ بشپ آف کینٹربیری کے نام۔

اسلام علیکم!

آپ کو معلوم ہوگا کہ شری رنگ پٹم کے مقام پر ٹیپو سلطان کے خلاف لڑتے ہوئے انگریزی فوجوں نے تین مسجدوں کو شہید کر دیا تھا۔ علاوہ جانی اور روحانی نقصان کے صرف مالی نقصان کا اندازہ دس لاکھ روپے کا ہے جو انگریزی تاریخ نگاروں کے تاریخی ریکارڈ سے ثابت کیا جا سکتا ہے جس کی ایک نقل میں اس خط کے ساتھ نتھی کر رہا ہوں۔ مجھے پورا بھروسہ ہے کہ فلے ڈیلفیا کے گرجا گھر کی مثال کو سامنے رکھ کر ہمیں بھی دس لاکھ کا ہرجانہ ضرور ادا کر دیا جائے گا۔ مسجد اور گرجا گھر دونوں خدا کے گھر ہوتے ہیں اور سمجھے جاتے ہیں۔ لہٰذا گرجا گھر کے ہرجانے کو نظر میں رکھتے ہوئے اس خاکسار کو مسجد کا ہرجانہ دلوایا جائے۔ یہ بات میرے لئے اور حامیان اسلام کے لئے بے حد تشکر و امتنان کا باعث ہوگی۔

مخلص

الحاج مولانا صلاح الدین چشتی

امام مسجد، شری رنگ پٹم

"تیسرا خط"

ماسٹر تارا سنگھ کی طرف سے، لارڈ ہوم کے نام۔

ست سری اکال!

آپ جانتے ہیں اور ساری دنیا جانتی ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ شیر پنجاب کے وارثوں پر انگریزوں نے فوجی دباؤ ڈال کر ان سے کوہ نور ہیرا چھین لیا تھا۔ اس دھاندلی کے خلاف اس وقت بھی آواز اٹھائی گئی تھی اور انگریزی

حکومت کے دوران میں بھی ہندوستانیوں کی طرف سے بار بار احتجاج کیا گیا تھا اب جب کہ انگریزی حکومت پرانے قرضے چکا رہی ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کوہ نور ہمیں واپس دیدیا جائے۔ جوہریوں کے اندازے کے حساب سے کوہ نور کی قیمت آٹھ کروڑ روپے ہوتی ہے۔ ہم کو کوہ نور فوراً مل جانا چاہیئے۔

"چوتھا خط"

بیگم رفعت محل آف لکھنؤ کی طرف سے، انگریزی چانسلر کے نام۔

آداب عرض!

بیگمات اودھ کے قصہ سے تو آپ واقف ہوں گے۔ جب کمپنی بہادر کو اپنی فوجوں کو تنخواہ بانٹنے کے سلسلہ میں روپیہ کی سخت ضرورت پڑی تو اس وقت کے جناب لاٹ صاحب بہادر وارن ہیسٹنگز مرحوم نے (خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) بیگمات اودھ کا سارا خزانہ ضبط کر لیا تھا جو کچھتر کروڑ روپے کی مالیت کا تھا۔ ازراہ کرم وہ رقم جلد سے جلد ارسال فرمائیے۔ ان دنوں لکھنؤ میں سیلاب بھی آ رہا ہے۔ اس لئے بندی اگر رقم جلد وصول پائے گی تو آپ کے جان و مال کو دعا دے گی۔ امید ہے آپ اس ذرا سی رقم کے لئے مجھے یاددہانی کا موقع نہ دیں گے۔

"پانچواں خط"

میئر آف کلکتہ کی طرف سے، میئر آف لندن کے نام۔

یہ میں کیا سنتا ہوں؟ انگریزی چانسلر نے آج سے دو سو سال پہلے ایک امریکی گرجا گھر کا جنگلہ ٹوٹ جانے پر چھ پونڈ آٹھ شلنگ ایک پنس کی بہت بڑی رقم ادا کی ہے؟

کیا رقم ادا کرتے وقت وہ بلیک ہول آف کلکتہ کا واقعہ بھول گئے جو لارڈ کلائیو

کی بدمعاشی اور بری عادت کی وجہ سے ہوئی تھی اور جس میں درجنوں بنگالیوں کی جانیں چلی گئی تھیں۔ یقیناً ایک انسان کی زندگی گرجا گھر کی ایک دیوار سے زیادہ قیمتی ہے۔ مہربانی کر کے ان جانوں کا ہرجانہ ان کے وارثوں کو ادا کر کے بنگالی قوم کو شکریہ کا موقع دیجئے۔ مرنے والوں کے وارثوں کی تعداد آج دو لاکھ سے اوپر ہے۔ ہر آدمی کو ایک سو روپیہ ادا کرنے پر یہ ہرجانہ دو کروڑ پچاس لاکھ اکھتر ہزار نو سو سات روپے سات آنے تین نئے پیسے ہوگا۔ اگر آپ نے یہ روپیہ ادا نہ کیا تو ہم آپ کے چھ پونڈ آٹھ شلنگ ایک پنس والے چیک کو نقض ایکسا سٹنٹ سمجھنے پر مجبور ہوں گے۔

"چھٹا خط"

ہندوستان کے وزیر اعظم کی طرف سے، انگریزی وزیر اعظم کے نام۔

یور ایکسی لینسی!

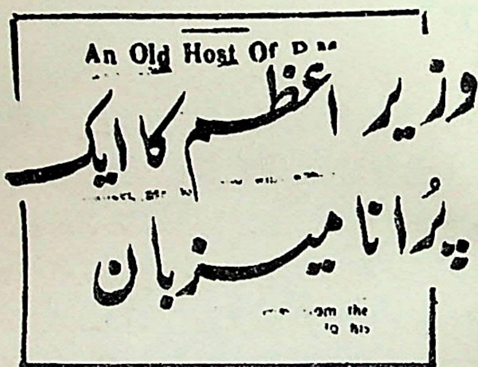
یہ کہنا مشکل ہے کہ برطانوی چانسلر نے آج سے دو سو برس پہلے کے گرجا گھر کے نقصان کا ہرجانہ ادا کر کے صحیح قدم اٹھایا ہے یا غلط۔ میں مذہبی آدمی نہیں ہوں لیکن اس قصہ کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ اگر ایک ہرجانہ ادا کیا جا سکتا ہے تو دوسرا کیوں نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس بات کا بھی آسانی سے فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ دنیا بہت پیچیدہ ہے اور اس میں اتنی طاقتیں اتنے رجحانات اتنے جذبات کام کرتے ہیں کہ کسی ایک نتیجہ پر پہنچنا بہت مشکل ہے۔ بہرحال اس دنیا میں زندگی کی حقیقتوں سے آنکھ ملانی ہی پڑتی ہے، چاہے وہ ایٹم بم ہو یا ... ...

اب یہ ایک تاریخی سچائی ہے کہ انگریزی حکومت کے زمانہ میں جب ہندوستانی قوم غلام اور پسماندہ تھی، سارے ملک میں اٹھارہ بڑے بڑے قحط پڑے تھے (میں کامن ویلتھ کے رشتے کو خیال میں رکھتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قحطوں کا ذکر نہیں کروں گا) جن میں جان و مال کے نقصان کی سیدھی ذمہ داری انگریزی حکومت کی تھی اور ہے۔ ان

قحطوں میں اڑیسہ کی ایک تہائی آبادی اور بہار کی ایک چوتھائی آبادی ختم ہوگئی پچھلی جنگِ عظیم کے دنوں میں بنگال کے قحط میں پینتیس لاکھ بنگالی موت کا شکار ہوگئے۔ بھارت سرکار نے اس جان و مال کے نقصان کا اندازہ پچیس ملین کھرب پونڈ لگایا ہے۔ میں بھارت سرکار اور برٹش سرکار کی گہری دوستی اور بین الاقوامی بہبودی کو مدنظر رکھتے ہوئے امید کرتا ہوں کہ آپ جلد سے جلد حکم دیں گے کہ پچیس ملین کھرب پونڈ کی رقم چیک کے ذریعہ ہندوستانی خزانے کو بھیجدیں گے۔

• • •

سنا ہے کہ ان خطوں کے بعد برٹش وزیروں کی ایک خاص میٹھک بلائی گئی۔ کارروائی کے دوران میں معلوم ہوا کہ نہ صرف بھارت سے بلکہ لنکا سے، پاکستان سے، ملایا سے، برما سے، سنگاپور سے، بورنیو سے، چین سے، مصر سے عراق سے، افریقہ سے، ویسٹ انڈیز سے اور دوسری ان تمام جگہوں سے جہاں برطانیہ کی حکومت رہ چکی ہے، ہزاروں خط اسی سلسلے میں ملے ہیں۔ ان میں سے ہر خط اسی قسم کے قرضے کے بارے میں ہے۔ مگر جب ان رقموں کو جوڑا گیا تو معلوم ہوا کہ اگر ہر جانہ کی کل رقم ادا کر دی جائے گی تو مالی اعتبار سے انگلینڈ بالکل اسی جگہ پہنچ جائے گا جہاں وہ آج سے ٹھیک دو سو سال پہلے تھا۔



An Old Host Of
وزیر اعظم کا ایک
پرانا میزبان

پھٹا لحاف

آنند بھون میں ایک لمبا کمرہ ایل کی شکل کا ہے۔ کمرے میں اس قدر گہرے
اور دبیز غالیچے بچھے ہیں کہ قدموں کی چاپ سنائی نہیں دیتی اور پنڈت نہرو کی میز
وہاں بچھی ہے۔ ایک کونے میں کہ جب تک آدمی میز کے بالکل قریب نہ آجائے
وہ پنڈت جی کو نہیں دیکھ سکتا۔ بڑی میز کے قریب بائیں طرف ایک بڑی فرنچ
کھڑکی ہے، لمبی اور مخروطی اور ترشی ہوئی۔ انسان کی انگلی کی طرح آسمان کی
طرف کھلتی ہوئی۔ پنڈت جی میز سے سر اٹھا کر کبھی کبھی باہر آسمان کی طرف اس
طرح دیکھ لیتے ہیں جیسے وہ اس انگلی سے ستاروں کو چھو لینا چاہتے ہوں۔ شام
کا وقت ہے، کمرے میں اندھیرا بڑھ چلا ہے۔ کچھ اس لئے بھی کہ گہرے گہرے
رنگوں والے دبیز پردے روشنی کو اندر نہیں آنے دیتے جو ابھی تک باہر افق
پر کھلی ہوئی ہے۔ میز پر ایک ٹیبل لیمپ پڑا ہے۔ پردہ اٹھنے کے چند سیکنڈ
بعد پنڈت جی آہستہ سے ٹیبل لیمپ کا سوئچ دباتے ہیں۔ سوئچ دبلتے ہی ان
کا سوچ میں ڈوبا ہوا چہرہ روشن ہو جاتا ہے اور ان کی کرسی کے پیچھے ہندوستان

کا بڑا نقشہ صاف اور واضح صورت میں نظر آنے لگتا ہے۔
ایک سیکریٹری آتا ہے، دیکھتے ہی ہکا بکا رہ جاتا ہے۔ پنڈت جی کہتے ہیں۔

پنڈت نہرو: دیکھئے کیا ہو؟ کاغذات پیش کرو۔

سیکریٹری نمبر۱: لاؤس کمیشن کو پھر سے جگانے کے متعلق یو این او کے سیکریٹری جنرل کو جو تار بھیجا جائے گا اس کا مسودہ تیار ہے، دیکھ لیجئے، مگر آپ کہاں چلے گئے تھے؟

پنڈت نہرو: کہیں نہیں، یہیں تھا (مسودہ دیکھتے ہوئے) مگر یہ — یہ — یہ کیا ہے؟ یہ تو لومبا کے بارے میں میرا مسودہ ہے۔ کیا — کیا — کیا تم — یہ نہیں جانتے کہ لاؤس اور لومبا میں کیا فرق ہے؟ (زور سے کاغذات پھینک دیتے ہیں۔)

سیکریٹری نمبر۱: ساری سر! ٹائپسٹ سے غلطی ہوگئی میں دوبارہ لاتا ہوں۔
[جلدی سے کاغذ اکٹھا کرتا ہے، اتنے میں دوسرا سیکریٹری آتا ہے]

سیکریٹری نمبر۲: یوپی کے کانگریسیوں میں جو دھڑے بندی جاری ہے، اس کے سلسلے میں کچھ کانگریسی آپ سے ملنے آئے ہیں۔

پنڈت نہرو: کون لوگ ہیں یہ؟

سیکریٹری نمبر۲: دو آدمی دھڑہ نمبر۱ کے ہیں، دو آدمی دھڑہ نمبر۲ کے ہیں اور ایک آدمی دھڑہ نمبر۳ کا ہے۔

پنڈت نہرو: مگر میں ان لوگوں سے شاید صبح مل چکا ہوں۔

سیکریٹری نمبر۲: مگر پنڈت جی وہ کہتے ہیں کہ صبح سے شام تک یوپی کے پالیٹکس میں بڑی بھاری تبدیلی آچکی ہے۔

پنڈت نہرو : حیرت ہے صاحب، جو تبدیلی میں حالات میں سترہ سال کی کوشش سے نہ لا سکا وہ یہ لوگ گیارہ گھنٹوں میں لے آئے ۔ حیرت ہے صاحب!!

[تیسرا سیکریٹری بھاگا بھاگا آتا ہے]

سیکریٹری ۳ : سر، چوتھے دھڑے کا نمائندہ بھی آ گیا ۔

پنڈت جی جلدی سے لپک کر دائیں طرف کے پردے کو ذرا سا ہٹا کے دیکھتے ہیں اور غصے سے کہتے ہیں ۔

پنڈت نہرو : سب دھڑ ہی دھڑ نظر آتے ہیں سر تو کسی کا نظر نہیں آتا۔ نہیں میں نہیں ملوں گا ان سے ! بہت ہو گیا، بہت ہو گیا !۔

سیکریٹری ۳ : مگر پنڈت جی .. .. !

پنڈت نہرو : دیکھتے نہیں ہو میں اس وقت پلاننگ کمیشن کی چوتھی یوجنا کے بارے میں اپنی رپورٹ تیار کر رہا ہوں، کیا یہ جھگڑنے والے لوگ مجھے کام نہیں کرنے دیں گے ۔ نہیں ملوں گا، نہیں ملوں گا ـــــ کسی سے نہیں ملوں گا، اس وقت ـــ ـ جاؤ"

پنڈت جی کرسی پر بیٹھے بیٹھے گھوم جاتے ہیں اور پھر ایک دم کھڑے ہو کر ہندوستان کا نقشہ دیکھنے لگتے ہیں ۔ تینوں سیکریٹری سر جھکا کر واپس چلے جاتے ہیں ۔ پنڈت جی کے دونوں ہاتھ اپنی کمر کے پیچھے آ کر ایک دوسرے میں بے چینی سے گتھ جاتے ہیں جیسے ان ہاتھوں میں لڑائی ہو رہی ہو ـــ !

ایک آواز آتی ہے !

آواز : شانتی ! شانتی !۔

پنڈت جی تیزی سے گھوم کر پلٹتے ہیں، کہتے ہیں ۔

پنڈت جی : کون ہے ؟ کہہ جو دیا میں کسی سے نہیں ملوں گا۔

میز سے چند قدم دور، روشنی کے ہالے سے باہر کمرے کے اندھیرے میں ایک آدمی کھڑا ہے۔ اس کی صورت نظر نہیں آتی، اس کا لباس صاف طور سے دکھائی نہیں دیتا صرف اس کی بھاری آواز سنائی دیتی ہے۔

آواز: شانتی! شانتی!۔

پنڈت جی ایک لمحے کے لئے میز پر ایک کونے میں اپنے سامنے رکھے ہوئے بھگوان بدھ کے مجسمے کو چھو کر اس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

پنڈت جی: ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا شاید تم مجھ سے بولے! ــــ (سر اٹھا کر) کون ہو تم ؟ مجھے شانتی کی تلقین کرنے والے۔۔۔ ذرا سامنے تو آؤ۔

وہ آدمی اندھیرے سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا میز کے قریب روشنی کے ہالے کے اندر آتا ہے اور اب اس کا بھورا جھریوں بھرا چہرہ اور اس کی سپید داڑھی صاف نظر آتی ہے پھر اس کا لباس بھی نظر آنے لگتا ہے۔ اس بڈھے آدمی نے ایک پھٹا ہوا لحاف اوڑھ رکھا ہے جس میں جا بجا روئی کے پھوسڑے باہر نکلے نظر آرہے ہیں۔ لحاف پھٹا ہونے کے علاوہ تیل اور میل کے چکتوں سے داغدار ہو رہا ہے۔ پنڈت جی اسے نہ پہچان کر کہتے ہیں۔

پنڈت نہرو: کون ہو تم ؟

بڈھا: تمہارا اپنا ساتھی، پہچان لو۔۔۔!

وہ بڈھا آدمی میز پر جھک کر پنڈت جی کے بالکل قریب آکر اپنی صورت دکھاتا ہے۔ پنڈت جی کے چہرے پر چند لمحوں تک شک وشبہات کی لہریں اُبھرتی ہیں، پھر یکایک صاف ہو جاتی ہیں ــــ اور وہ خوشی سے چلا کر کہتے ہیں ــــ

پنڈت نہرو : ارے بڑے بھیا ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ !

پنڈت جی جلدی سے آ کر اس بڈھے آدمی سے بغل گیر ہوتے ہیں۔ بڈھا بھی اپنی دونوں بانہیں پنڈت جی کے گلے میں ڈال کر رونے لگتا ہے ۔ ۔۔ ۔۔ !

بڈھا : جواہر ! تم نے مجھے پہچان لیا آخر ۔ ۔۔ ہاں میں ہوں تمہارا بڑا بھیا ۔ بھگوان دین ! پرتاپ گڈھ والا ۔۔ ۔۔ ۔۔ آخر تم نے مجھے پہچان ہی لیا ۔۔ ۔۔ ۔۔ !

بڈھا اپنے آنسو پونچھتا ہے ، اپنے پھٹے ہوئے لحاف کے ایک کونے سے ۔ پنڈت جی اس کی بغل میں ہات دبکرا سے اپنے پاس ایک کونے میں بچھے ہوئے دیوان پر بٹھاتے ہیں ۔ بڈھا اپنی خوشی کے آنسو پھر پونچھتا ہے ۔

پنڈت نہرو : منی کیسی ہے ؟

بھگوان دین : منی کا بیاہ ہو گیا ، اب تو بھگوان کی کرپا سے اس کے دو بچے ہیں ۔

پنڈت نہرو : اور دینو ؟

بھگوان دین : دینو بڑا ہو گیا اور کان پور چلا گیا ۔ کارکھانے میں نوکر ہے ، کبھی کبھی اس کی چٹھی آ جاتی ہے ۔ ۔۔ !

پنڈت جی : اور بھوجائی ۔۔ ۔۔ ؟

بھگوان دین : تمہاری بھوجائی مر گئی ۔

پنڈت جی : ارے ۔۔ ۔۔ تم نے مجھے خط نہیں لکھا ؟

بھگوان دین : کیا لکھتا ؟ لوگ تو روز ہی مرتے رہتے ہیں ۔

وقفہ

پنڈت جی خاموش ہو جاتے ہیں ، پھر گفتگو کا لہجہ بدل کر کہتے ہیں ۔

پنڈت جی : اور تمہارا بڑا لڑکا کہاں ہے ، وہ تو اب جوان ہو گیا ہو گا ؟

بھگوان دین: وہ تو گاؤں میں ہے اور جوان بھی ہوگیا ہے، اور اس کا بیاہ بھی ہوگیا ہے۔

پنڈت نہرو: گھر میں اور تو ہر طرح سے خیریت ہے؟ سب ٹھیک ہے نا؟ کب سے تمہارے گھر کو نہیں دیکھا۔۔۔۔!

بھگوان دین: گھر تو وہی ہے، اور گاؤں بھی وہی ہے۔

پنڈت نہرو: کہو، الہ آباد کیسے آئے؟ کوئی کام تھا؟

بھگوان دین: تم سے ملنے آیا تھا اور مل کر تمہیں نیوتہ دینے آیا تھا!

پنڈت نہرو: کیسا نیوتہ؟

بھگوان دین: کھانے کا نیوتہ! یاد ہے، جب کبھی تم ہمارے پرتاپ گڑھ سے گذرے تم نے ہمیشہ میرے ہاں کھانا کھایا۔۔۔۔!

پنڈت نہرو: بھول سکتا ہوں؟ چنے کا ساگ اور مکئی اور باجرے کی روٹی بھوجائی کے ہات کی سینکی ہوئی۔ کیسے بھول سکتا ہوں؟ وہ آزادی کی لڑائی میں تمہاری مضبوط رفاقت اور محبت، دلیری اور جرأت۔۔!

بھگوان دین: تو آج میرے گھر چلو۔

پنڈت نہرو: آج تو نہیں۔۔۔۔!

بھگوان دین: تو کل!

پنڈت نہرو: کل بھی نہیں۔

بھگوان دین: پرسوں!

پنڈت نہرو: پرسوں بھی نہیں، ابھی تو فرصت نہیں ہے بڑے بھیا، بہت کام ہے۔ ۔۔۔مگر میں کسی دن آؤں گا۔

بھگوان دین: کس دن آؤ گے؟ ستر سال ہوگئے تمہاری راہ دیکھتے دیکھتے۔

گیارہ سال سے میرے گھر کی مفلسی تمہارا انتظار کرتی ہے۔ میرے کھیتوں
کی بھوک تمہارا انتظار کرتی ہے، جواہر!

پنڈت نہرو: مجھے شرمندہ مت کرو بڑے بھیّا... کیا ہم... کیا...
ہم... ہم تمہارا پھٹا ہوا لحاف نہیں دیکھ سکتے... ارے
بھائی اتنی سردی بڑھ چلی ہے اور تم یہی پھٹا ہوا لحاف اوڑھے
ہوئے ہو...؟

[زور سے گھنٹی بجاتے ہیں، ایک نوکر نمودار ہوتا ہے]

پنڈت نہرو: شیامو، ایک نیا کمبل لے کر آؤ، دیکھو، دیکھو... خوب موٹا
اور مضبوط ہو، اور ایک نئی جرسی لے کر آؤ، ان کے لئے... اونی
جرسی... ان کے سائز کی ہو، اچھی طرح سے دیکھ لو... سائز
سمجھ لو...!

شیامو: جی بہت اچھا۔

پنڈت نہرو: کھڑکی بند کر دیں بڑے بھیّا، باہر سے ٹھنڈی ہوا آتی ہے۔

بھگوان دین: نہیں کھلی رہنے دو، اس میں سے آسمان دکھائی دیتا ہے اور
تارے بھی...!

پنڈت نہرو: (ہنس کر) ہاں مجھے یاد ہے، جیل میں بھی تم ہمیشہ کمرے کے
بجائے کھلے لان میں سونا پسند کرتے تھے، آسمان کے نیچے تاروں
بھری چھاؤں میں...!

بھگوان دین: میں ایک کسان ہوں نا...!

پنڈت نہرو: مگر جب تو تمہاری حالت اچھی تھی، جب تو ہم تمہارے گھر بھی
گئے تھے: پھر کیا ہوا؟

بھگوان دین : پھر آزادی مل گئی ۔!

پنڈت نہرو : تو آزادی کیا نہ ملتی ؟ آزادی سے کیا نقصان ہوا، آزادی ملتے ہی ہم نے زمینداری ختم کر دی جو انگریزوں کے زمانے میں کبھی ختم نہ ہوتی۔

بھگوان دین : زمینداری ختم ہوئی تو بھومی داری آگئی، زمین پر ملکیت تو کسی نہ کسی کی رہی۔ کھیت مجور کبھی وہیں رہے، زمین بھی اسی طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹی رہی، کسان اسی طرح بارش کے لئے آسمان کی طرف دیکھتے رہے۔ کبھی تو ایک بوند نہ برسی اور کبھی آسمان یوں برسا کہ ساری فصل بہا کے لے گیا۔ اور تم جانتے ہو جواہر، ایک کسان کی خوشحالی کتنی ناپائیدار ہوتی ہے۔ ایک سوکھا یا ایک سیلاب آیا اور گھر کی ساری خوشحالی ختم ہو گئی۔ تمہاری بھوجائی فاقے سے مر گئی، دینو بھوکا چلا گیا، گھر کی دیواریں ڈھے گئیں .. .. .. تم نے بہت اچھا کیا جو میرا نیوتہ نہیں مانا۔ مانتے تو آج میں تمہیں چنے کا ساگ اور باجرے کی روٹی بھی نہ کھلا سکتا .. .. .. !

[پنڈت جی اٹھ کر غم اور غصے سے ٹہلنے لگتے ہیں۔ ان کے ہاتوں کی انگلیاں بے چین ہیں۔ یکایک باہر سے شور سنائی دیتا ہے۔ پنڈت جی غصے سے پلٹ کر پوچھتے ہیں۔]

پنڈت نہرو : بڑے بھیا، یہ باہر کیسا شور ہو رہا ہے ؟

بھگوان دین : وہ جو ہم پر حکومت کرتے ہیں وہ آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔

پنڈت نہرو : (پاؤں پٹک کر غصے سے) نان سینس۔

بھگوان دین : وہ جھگڑتے ہیں اور میرا لحاف پھٹا جا رہا ہے۔

[پنڈت جی خاموشی سے ٹہلتے جاتے ہیں۔]

بھگوان دین : اور کھیت سوکھتے جاتے ہیں۔

وقفہ

بھگوان دین : اور گاؤں کے گھر گرتے جاتے ہیں!

وقفہ

بھگوان دین : اور بچے بمبئی کو بھاگتے جاتے ہیں یا کان پور کو یا احمد آباد کو۔
گاؤں کی گلیوں میں صرف بڈھے رہ گئے ہیں یا اندھے۔

وقفہ

بھگوان دین : بڈھوں کے لئے کوئی کام نہیں ہے، اور بچوں کے لئے کوئی اسکول نہیں ہے!

پنڈت جی جو اس دوران میں غصے سے ٹہل رہے تھے اور ٹہلتے ٹہلتے ان کے غصے کا پارہ دمبدم بڑھتا جارہا تھا، یکایک پلٹ کر بھگوان دین کے سامنے آکر کہتے ہیں۔

پنڈت نہرو : How do you expect me to change all this in seventeen years:
سترہ سالوں میں تمہیں معجزہ کہاں سے لاکے دکھا دیتا ؟ غریبی دور کرنے کے لئے میرے پاس کوئی الہ دین کا چراغ تو نہ تھا ۔ ۔ ۔ پھر بھی ہم کوشش کرتے رہے۔ جانتے ہو، انگلینڈ کو موجودہ خوشحالی حاصل کرنے کے لئے چار سو سال لگے، امریکہ کو ڈیڑھ سو سال، روس نے چالیس سال لئے۔ میں سترہ سال میں کیا کر دوں ؟ اس سے زیادہ ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لوگ جھگڑتے ہیں، لوگ کام نہیں کرتے۔ لوگ بے ایمان ہیں، لوگوں کے دل میں دیش کا درد نہیں ہے، تو دیش آگے کیسے بڑھے گا۔

It is a problem برے بھیا۔ ۔ ۔ لوگوں کو کیسے بدلا جائے۔ یہ بڑا بھاری پرابلم ہے ہمارے سامنے، ہم کیسے بدلیں؟ کیسے آگے جائیں؟ ـــ مگر دھیرے دھیرے کام ہو رہا ہے، دھیرے دھیرے ملک میں صنعتیں ترقی کر رہی ہیں، دھیرے دھیرے ڈیم بن رہے ہیں، دھیرے دھیرے سوکھے کھیتوں میں پانی بھی آجائے گا! ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ہو تو رہا ہے مگر بہت دھیرے دھیرے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

بھگوان دین: خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک!

پنڈت نہرو: (کچھ سوچ کر) اور ایک دن میری خاک سے ہری کونپلیں بھی پھوٹیں گی ۔ ۔ ۔ ۔ لو تمہارا کمبل آگیا ۔ ۔ ۔ ۔ اور نئی جرسی بھی۔ ۔ ۔ انہیں پہن لو۔

بھگوان دین: نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں ۔ ۔ ۔ !

پنڈت نہرو: پہن لونا ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں پہنو گے تو ہم خود پہنا دیں گے۔ تنیا ہو! تم ان کے ہات پکڑو میں جرسی پہناتا ہوں، دیکھتا ہوں کیسے نہیں پہنتے ہیں!

پنڈت جی زبردستی بڈھے کسان کو جرسی پہنا دیتے ہیں اور اس کا پھٹا لحاف الگ کر کے اسے نیا کمبل اڑھا دیتے ہیں اور خوش ہو کر کہتے ہیں۔

پنڈت نہرو: دیکھو، اب تو تمہیں سردی نہیں لگ رہی ہے نا؟ اب تو سب ٹھیک ہے نا؟

بڈھا خوش ہو کر اپنے نئے کمبل کو دیکھتا ہے، اپنی نئی جرسی کو چھوتا ہے اور خوش ہو کر گلوگیر لہجے میں کہتا ہے۔

بھگوان دین: ہاں یہ کمبل تو بہت اچھا ہے ۔ ۔ ۔ ہاں یہ اونی بنڈی بھی

بہت عمدہ ہے .. .. !

پنڈت نہرو : شیاباش، .. .. .. اس پھٹے ہوئے لحاف کو باہر پھینک دو۔

[بڈھا نوکر سے لحاف چھین لیتا ہے]

بھگوان دین : مگر میرے گاؤں میں اور بھی پھٹے ہوئے لحاف ہوں گے۔

پنڈت نہرو : اونہہ ہوں !

بھگوان دین : تین سو کے قریب پھٹے ہوئے لحاف ہوں گے، صرف میرے گاؤں میں، اور اگر آس پاس کے گاؤں بھی شامل کر لئے جائیں۔

.. .. .. تو .. .. .. ؟

پنڈت نہرو : اونہہ ہوں !

بھگوان دین : اور میرے بڑے بیٹے کو سردی کھا کھا کر تپ دق ہو گیا ہے اور دور دور تک ہمارے علاقہ میں کوئی اسپتال نہیں ہے اور جہاں اسپتال ہے وہاں کوئی بستر خالی نہیں ہے !

باہر کا شور پھر بڑھ جاتا ہے، ایک کے جھگڑنے والوں کی آوازیں بھی صاف صاف سنائی دیتی ہیں۔

ایک آواز : واہ، تمہارے دھڑے کے تین وزیر لئے جائیں، اور ہمارا صرف ایک۔

آواز ۲ : اور ہمارے دھڑے سے ایک وزیر بھی نہ لیا جائے۔

آواز ۳ : اور تمہارا دھڑا اسپیکر شپ بھی لے جائے۔

آواز ۴ : جو نیا افسر چلا آ رہا ہے، بنارس سے چلا آ رہا ہے۔

آواز ۵ : تو کیا تمہارے سیتا پور سے آئے۔

آواز ۶ : سیتاپور کی ایسی تیسی

آواز ۲ : تمہاری ایسی تیسی !

شور بڑھتا جاتا ہے، پھر یکایک کم ہو کر دور ہوتا جاتا ہے، جیسے شور کرنے والے باہر دھکیلے جا رہے ہوں۔ بڈھا بھگوان دین پنڈت نہرو کے قریب آکر کہتا ہے۔

بھگوان دین : یہ لوگ سمجھانے سے ٹھیک نہ ہوں گے۔

پنڈت نہرو : میں زبردستی کرنے کے خلاف ہوں۔ میں لوگوں کی ذہنیت بدلنا چاہتا ہوں چاہے وہ دھیرے دھیرے ہی کیوں نہ بدلے ؟

بھگوان دین : ابھی تو کام دھیرے دھیرے ہو رہا ہے، اور میں مانتا ہوں کہ کام ہو رہا ہے مگر جس رفتار سے رشوت ستانی، بے ایمانی، خویش پروری، فرقہ پرستی اور ذات پات کی حمایت بڑھ رہی ہے اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد یہ دھیرے دھیرے آگے بڑھنے والا کام بھی بند ہو جائے گا۔۔ ۔۔ ۔۔ پھر تم کیا کرو گے ؟

پنڈت نہرو : میں لڑوں گا۔ ۔۔ ۔۔ میں لڑوں گا۔۔۔ ۔۔ میں محبت کے ہتھیار سے لڑوں گا۔۔ ۔۔ ۔۔ !

بھگوان دین : تم بہت بھلے آدمی ہو۔۔ ۔۔ ۔۔ جواہر، بہت نیک آدمی ہو۔ تمہارے دل میں کسی کے لئے برائی نہیں ہے۔۔ ۔۔ ۔۔ تم چاہتے ہو کہ بے ایمان، کینہ پرور، منافع خور لوگوں کا دل بھی محبت سے بدل دیا جائے۔۔ ۔۔ مگر آج وقت بہت کم ہے اور لوگ تین سو سال تک انتظار نہیں کر سکتے۔ وہ لوگ جو بھوکے ہیں اور ننگے ہیں اور جہالت اور بیماری کے مارے ہیں، کب تک پتھر سے آنسو نکلنے کا انتظار کریں گے۔۔ ۔۔ ۔۔ ذرا سوچو۔۔ ۔۔ ۔۔ میرے بھائی۔

.. ... ہم دونوں نے آزادی کی خاطر جیل میں عمریں بتائی ہیں .. ۔
.. تم نے اور میں نے .. .. یہ دیش تمہارا گھر ہے اور میرا گھر
بھی ہے۔ تم لوگوں کو بھگوان بدھ کے راستے پر چلانا چاہتے ہو،
آج اس دیش کو ایک شنکر آچاریہ کی ضرورت ہے۔
پنڈت نہرو چونک کر بھگوان دین کی طرف دیکھتے ہیں اور کھلی کھڑکی
میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور آسمان میں کھلے ہوئے تاروں کی طرف
دیکھنے لگتے ہیں۔ اب ان کی پیٹھ بھگوان دین کی طرف ہے۔
بھگوان دین آہستہ سے مسکراتا ہے، وہ بھی آگے بڑھ کر کھلی کھڑکی
میں کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنا ہات پنڈت نہرو کی کمر میں ڈال دیتا ہے۔ پنڈت
نہرو اس کی طرف دیکھے بغیر آسمان کی طرف تکتے ہوئے کہتے ہیں۔
پنڈت نہرو: کبھی کبھی میں بہت اکیلا پن محسوس کرتا ہوں۔
بھگوان دین: کبھی کبھی مجھے بھی احساس ہوتا ہے کہ تم بالکل اکیلے رہ گئے ہو
تمہیں پرانے دوستوں کی ضرورت ہے، میرے جیسے کسانوں کی ...
.. .. اور شاید نئے دوستوں کی بھی ضرورت ہے جیسے میرا بیٹا دینو ہے
جو کان پور کے کارخانے میں کام کرتا ہے .. .. .. !
پنڈت نہرو: میں تھک گیا ہوں، مجھے سردی لگ رہی ہے، بڑے بھیا
اپنا لحاف مجھے دیدو۔
بھگوان دین: ہاں، میرا پھٹا ہوا لحاف اوڑھ لو۔ اس میں تین پشتوں
کی ترسی ہوئی آرزوئیں بند ہیں .. .. .. یہ لحاف اوڑھ لو، اور
میرے گاؤں چلو، چلو ... . جواہر۔ کیوں کہ صبح دم ہوا کے
پہلے جھونکے کی طرح اور امڈی ہوئی گھٹاؤں کے پہلے قطرے

کی طرح لوگ ہر جگہ کھیتوں میں تمہارا انتظار کرتے ہیں !

پنڈت نہرو وہ پھٹا ہوا لحاف اوڑھ لیتے ہیں اور بھگوان دین کے ہاتھ میں ہاتھ دیکر کھڑکی سے پلٹ کر بھگوان دین کے ساتھ چلے جاتے ہیں سارے کمرے میں اندھیرا چھا جاتا ہے ، صرف بھگوان بدھ کی مورتی پر روشنی کی ایک ہلکی سی چھوٹ پڑ رہی ہے !

پردہ



MATRIMONIAL

Wanted Suitable' Match For A youngman aged 25, healthy and handsome, comes from respectable Khatari Kapur family, holding good career, well settled in busine·· income over Rs. Two Thou··· ·nthly. Girl's parents ··· ·· Box 4496 The T··· ··

··· ··3996 ··· And ···

شادی سے متعلق

··· in ··· ·pees ··· per mo··· ··· details ··· Times of In··· ···

Well-··· Pun··· ··· ···children in··· ···om middle-aged ··· ·ature minds preferal ··· ·ani professionals (medicos, ···rs) of independent means without encumbrance; view marriage. Send details in confidence to Box 4504 The Times of India, Delhi.

• D9068

RADIOS, GRAMOPHONES, ETC.

For Sale Phillips Tape Recorder In excellent condition. Contact Chandermohan 27, Nizamuddin East, New Delhi. Phone 74495. D9071

For Sale Imported Radiogram With built-in tape recorder. Price approximately Rs. 2,500. Write Box 4505 The Times of India, Delhi. D907?

رشتے کی ضرورت

سیٹھ جوکھم داس اپنے وسیع کیبن میں ساگوان کی ایک عمدہ میز سامنے رکھے ایک گھومنے والی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ ان کے بالکل قریب سیٹھ جوکھم داس کا چھوٹا بھائی سیٹھ لوکھم داس بیٹھا ہے۔ دونوں کے چہروں پر بھائیوں والی مشابہت پائی جاتی ہے۔ لباس ایک سا ہے، وضع قطع ایک سی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سیٹھ جوکھم داس عمر میں بڑا دکھائی دیتا ہے اور لوکھم داس اس کا چھوٹا ایڈیشن معلوم ہوتا ہے۔

سیٹھ جوکھم داس کے دائیں طرف ذرا فاصلے پر اس کا پرائیویٹ سیکریٹری بیٹھا ہے۔ ایک فائل آگے بڑھاتا ہے۔ سیٹھ جوکھم داس فائل دیکھ کر اپنے چھوٹے بھائی کی طرف مڑ کر کہتا ہے۔

لوکھم ؟

جی جوکھم !

اس فائل میں سات سو عرضیاں ہیں لڑکی والوں کی جو اپنی بیٹی کی شادی

میرے بیٹے گھوگھم داس سے کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے اس میں سے صرف سات عرضیاں چھانٹی ہیں اور آج انہیں انٹرویو کے لئے بلایا ہے۔

لوکھم: (خوش ہوکر) لڑکیوں کو؟ (فوراً اپنے سر کی پگڑی وغیرہ ٹھیک کرنے لگتا ہے۔)

جوکھم: لڑکیوں کو نہیں ان کے باپ کو۔

لوکھم: اوہ! (ہونٹ لٹک جاتا ہے)

جوکھم: میں باری باری ہر ایک کا انٹرویو لیتا جاؤں گا۔ تم غور سے سب کچھ دیکھتے اور سنتے جاؤ، اور تم (سیکریٹری سے مخاطب ہوکر) سب سوال جواب نوٹ کرتے جاؤ۔

سیکریٹری: ست بچن!

جوکھم: (فائل سے ایک عرضی نکال کے سیکریٹری کو تھماکے) اس عرضی والے کو بلاؤ۔

[سیکریٹری عرضی لیکر ایک لمحہ کے لئے خاموشی سے اس کا مطالعہ کرتا ہے پھر بڑی پھرتی سے ایک بٹن دباتا ہے، باہر گھنٹی ہوتی ہے۔ ایک چپراسی اندر آتا ہے۔]

سیکریٹری: شری بھیکم داس کو اندر بھیجو۔

چپراسی لوٹ جاتا ہے۔ چند لمحوں کے بعد کیبن میں شری بھیکم داس داخل ہوتا ہے چہرے بشرے سے ملنے جلنے کے انداز سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی والا ہے۔

جوکھم داس: بھیکم داس جی — آپ بھی جانتے ہیں کہ میں نے آپ کو کیوں بلایا ہے اور میں بھی جانتا ہوں کہ آپ یہاں کیوں آئے ہیں۔ لہذا بیکار

کی باتوں میں وقت ضائع نہ کرتے ہوئے میں اصلی مطلب کی بات پر آتا ہوں۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور آپ کا وقت بھی بہت قیمتی ہوگا، اس لئے نہایت مختصر گفتگو ہوگی۔ آپ کم سے کم الفاظ میں میرے سوالات کا جواب دیتے جائیے، میرا سیکریٹری سب گفتگو نوٹ کرے گا بعد میں فیصلہ سے آپ کو آگاہ کر دیا جائے گا۔ کہئے یہ طریقہ منظور ہے ؟

بھیکم داس : جی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔

جوکھم داس : بہت خوب ! ــــ اچھا ــــ تو (ہات میں پنسل لیکر اسے گھماتے ہوئے) لڑکی کا نام ؟

بھیکم : مینا کماری ــ مگر گھر میں سب لوگ اسے پیار سے مینا کہتے ہیں۔

لوکھم : مینا بہت پیارا نام ہے۔

جوکھم : لوکھم ؟

لوکھم : جی جوکھم۔

جوکھم : تم چپ رہو۔

لوکھم : (سہم کر) بہت اچھا۔

سیکریٹری : (لکھتے ہوئے) مینا کماری عرف مینا ؛

جوکھم : عمر ؟

بھیکم : بیس سال۔

جوکھم : رنگ ؟

بھیکم : جناب میری بیٹی کا رنگ گو سانولا ہے لیکن اس نے پچھلے سال نینی تال کی نمائش کے موقع پر بیوٹی کمپیٹیشن میں فرسٹ پرائز حاصل کیا ہے۔

لوکھم: مجھے خود سفید رنگ کی عورت پسند نہیں ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
آپ دلہن کے بجائے شلجم کھا رہے ہیں جس رنگ میں نمک نہ ہو وہ
رنگ پھیکا ہے، جس حسن میں ملاحت نہ ہو وہ حسن سیٹھا ہے۔

جوکھم: لوکھم؟

لوکھم: جی جوکھم!

جوکھم: شادی تمہاری نہیں ہو رہی ہے، گھوگھم کی ہو رہی ہے۔

لوکھم: اوہ!

جوکھم: لڑکی کا قد کیا ہے؟

بھیکم: پانچ فٹ تین انچ۔

جوکھم: کمر؟

بھیکم: کمر چھبیس انچ، سینہ پینتیس انچ، کولھا سینتیس انچ، وزن ایک من
تیس سیر، تعلیم نو جمع دو گیارہ جماعت۔

جوکھم: اوہ! آپ کو تمام اعداد و شمار خوب یاد ہیں۔

بھیکم: اکثر جگہ انٹرویو پر جانا پڑتا ہے اس لئے یہ اعداد و شمار ازبر ہو چلے ہیں۔

جوکھم: اچھا ہے اس سے وقت بچ جاتا ہے اور آج کل بزنس میں وقت ہی
روپیہ ہے۔ ہاں! اس سے خوب یاد آیا، آپ کتنا انکم ٹیکس ادا
کرتے ہیں؟

بھیکم: ایک لاکھ پچپن ہزار سالانہ۔

جوکھم: سیکریٹری، نوٹ کرو۔

سیکریٹری: ست بچن۔

جوکھم: سیٹھ بھیکم داس جی، آپ کی لڑکی بات چیت میں کیسی ہے؟

بھیکم : جیسے لڑکیاں بات چیت کرتی ہیں، شرما کے۔
جوکھم : میرے بیٹے گنو گھم داس کو شرمیلی لڑکی پسند نہیں ہے۔
بھیکم : یوں بینا بات کرنے پر آجائے تو گھنٹوں بات کر سکتی ہے۔ اس نے کالج کی ڈیبیٹنگ سوسائٹی میں فرسٹ پرائز بھی حاصل کیا تھا۔
جوکھم : مگر میرے بیٹے کو بہت زیادہ بات کرنے والی لڑکی بھی پسند نہیں ہے۔
بھیکم : یہ پرائز اس نے آج سے چار سال پہلے حاصل کیا تھا، اب تو وہ بہت کم بات کرتی ہے۔
جوکھم : گوشت کھاتی ہے؟
بھیکم : جی نہیں۔
جوکھم : مگر میرا بیٹا تو گوشت کھاتا ہے۔
بھیکم : تو وہ بھی کھالے گی۔
جوکھم : مگر اسے گوشت کھانے والی لڑکی پسند نہیں۔
بھیکم : تو وہ نہیں کھائے گی۔
جوکھم : مگر اسے ایسی لڑکی پسند ہے جو خود گوشت نہ کھائے مگر دوسروں کے لئے پکا دے۔
بھیکم : وہ ماس، مچھی، انڈا، مرغی سب پکانا جانتی ہے۔ رکھڑے مصالحہ کا قورمہ، میٹھے مصالحہ کا روغن جوش، نرگسی کوفتے اور لکھنوی کوفتیاں شامی کباب اور ایرانی پلاؤ سب پکانا جانتی ہے۔
جوکھم : آپ تو ایسے بات کرتے ہیں جیسے وہ کسی ہوٹل میں باورچن رہ چکی ہو۔

بھیکم : ہوٹل کی یا ور چینا تو نہیں ہوٹل کی مالک ضرور ہے۔ میں مائی لارڈ
ہوٹل کا مالک بھی ہوں، میری بیٹی کے ناطے سے مینا کا اس میں حصہ ہے۔

جوکھم : بائی لارڈ ہوٹل آپ کا ہے ؟

بھیکم : جی ہاں!

جوکھم : مائی گاڈ۔ آپ نے پہلے نہیں بتایا۔

بھیکم : پہلے آپ نے سوال ہی نہیں کیا۔

جوکھم : سیکریٹری، نوٹ کرو مائی لارڈ ہوٹل آپ کا ہے۔

لوکھم : مائی لارڈ ہوٹل میں آج کل ایک نئی کیبرے گرل آئی ہے مس جین اپا کا
عورت ہے یا بم کا دھماکہ ـــــ کیا آپ اسے جانتے ہیں ؟

جوکھم : لوکھم ؟

لوکھم : جی جوکھم ـــــ جی بہت اچھا ـــــ جی اب میں کچھ نہیں کہوں گا۔

جوکھم : معاف کیجیئے گا سیٹھ بھیکم داس جی، آپ کو بہت تکلیف دی۔ کل
بذریعہ ٹیلی فون آپ کو اپنے فیصلے سے مطلع کروں گا۔ ہاں عزیز گھوگھم
داس کے بارے میں اگر آپ کچھ دریافت کرنا چاہتے ہوں تو ضرور
دریافت کر سکتے ہیں (گھڑی دیکھ کر) میں آپ کو اس کے لئے دو
منٹ دوں گا۔

بھیکم : جی نہیں، مجھے سب معلوم ہے۔ عزیز گھوگھم بمبئی کے سب سے بڑے رئیس
اور بزنس مین کا بیٹا ہے۔ نویں فیل ہے ہکلاتا ہے، بے حد عیاش اوباش
اور خرچیلا ہے۔ غرضیکہ مکمل احمق ہے۔

جوکھم : (چونک کر) ـــ احمق ہے ... آپ جانتے ہیں ..... پھر
بھی اپنی بیٹی کی شادی میرے لڑکے سے کرنا چاہتے ہیں، کیوں ؟

بھیکم : کیوں کہ آج کل ہر شادی ایک بزنس پراپوزیشن ہوتی ہے۔ میں اپنی مینا کی شادی عزیز گھوکھم سے نہیں کر رہا ہوں، میں اپنی لڑکی کی شادی بمبئی کی سب سے بڑی بزنس کارپوریشن سے کر رہا ہوں۔

جوکھم : ہاتھ ملائیے سیٹھ بھیکم داس جی، آپ کی صاف گوئی مجھے بہت پسند آئی ہے۔ میں کل صبح دس بجے آپ کو ٹیلی فون کروں گا، ضرور کروں گا۔

بھیکم : او کے ۔۔۔۔ نمسکار!

جوکھم، توکھم : نمسکار۔

جب بھیکم کمرے کے دروازے سے باہر چلا جاتا ہے تو جوکھم اپنے سیکریٹری کی طرف مڑکر کہتا ہے۔

جوکھم : Next please

سکریٹری دوسری عرضی پر نظر ڈال کر بٹن دبا تا ہے۔ چپراسی اندر آتا ہے، سیکریٹری اس سے کہتا ہے۔

سیکریٹری : مسٹر جوحکم داس کو اندر بھیجدو۔

چپراسی چلا جاتا ہے، چند لمحوں کے بعد مسٹر جوحکم داس اندر آتے ہیں۔۔۔

جوکھم داس : تشریف رکھئے۔ (جوحکم داس بیٹھ جاتا ہے)

جوکھم : آپکا نام؟

جوحکم داس : جوحکم داس۔

توکھم : پہلے بھیکم داس آئے تھے اب جوحکم داس آگئے ہیں۔ آج جو آتا ہے داس ہی آتا ہے۔

جوحکم داس : دنیا میں دو طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ایک جو Boss

ہوتے ہیں دوسرے جو داس ہوتے ہیں۔

لوکھم: اور جو اس تفریق کو نہ مانیں؟

جوحکم داس: وہ نہ پاس ہوتے ہیں نہ داس ہوتے ہیں بلکہ سماج کے اصطبل کی گھاس ہوتے ہیں۔

جوکھم: (کھانس کر) اس قسم کے سب جھمیلے بکواس ہوتے ہیں (پھر کھانس کر) شری جوحکم داس جی، آپ بھی جانتے ہیں میں نے آپ کو کیوں بلایا ہے اور میں بھی جانتا ہوں کہ آپ یہاں کیوں آئے ہیں۔ لہٰذا بیکار کی باتوں میں وقت ضائع نہ کرتے ہوئے میں اصلی مطلب کی بات پر آتا ہوں میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور آپ کا وقت بھی قیمتی ہوگا، اس لئے نہایت مختصر گفتگو ہوگی۔ آپ کم سے کم الفاظ میں میرے سوالات کے جواب دیتے جائیے۔ میرا سیکریٹری گفتگو نوٹ کر لے گا۔ بعد میں فیصلے سے آپ کو آگاہ کر دیا جائے گا، کہئے یہ طریقہ منظور ہے؟

جوحکم داس: جوحکم!

جوکھم: اچھا تو سب سے پہلے نام بتائیے۔

جوحکم داس: نام اس کا شیلا ہے۔

جوکھم: قد؟

جوحکم داس: قد بوٹا سا ہے، نہ بہت اونچا نہ بہت چھوٹا بلکہ ایسا کہ اگر ڈرائنگ روم میں دیکھئے تو ڈرائنگ روم کی ساری سجاوٹ اسی سے ہو اور اگر بیڈ روم میں رکھئے تو بیڈ روم کا مرکز معلوم ہو۔

جوکھم: رنگ کیسا ہے؟

جوحکم داس: سنہری۔ نہ کالا نہ سانولا، نہ گندمی نہ گورا۔ یہ سب رنگ—

آوٹ آف ڈیٹ ہو چکے ہیں۔ اس کا رنگ تو بالکل سونے کا سا
دمکتا ہوا ہے۔ دیکھئے گا تو غش کھائیے گا۔

جوکھم: خدوخال ؟

جوحکم داس: خدوخال میں ہماری شیتا کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بہترین سے
بہترین مغربی ماڈل اس کے آگے پانی بھرتے ہیں۔ اس کی چھب،
بانکپن اور خطوط کی نازکی اجنتا کی سندرتا کو مات کرتے ہے۔

جوکھم: گا تی بھی ہیں ؟

جوحکم داس: گانا تو صاحب جس زبان کا چاہے سن لیجئے۔ اک ذرا اشارے
کی دیر ہے۔ ہندی اور گجراتی، مراٹھی بنگالی، سنہالی، تامل، تلگو
جس زبان کا گانا چاہے سن لیجئے اور جس رنگ کا جو چاہے دادرا
دھرپد، خیال، ٹھمری، فلمی قوالی، بھجن، کیرتن جو چاہے سنئے۔

جوکھم: میرے لڑکے کو گانے کا بہت شوق ہے وہ بالکل ایسی ہی چاہتا ہے۔

جوحکم داس: جو حکم، میں تو اسی لئے حاضر ہوا ہوں۔

جوکھم: اور تعلیم ؟

جوحکم داس: تعلیم ؟ عجیب سوال کیا آپ نے ۔ خیر ۔ تعلیم کا بھی انتظام ہے
اور یہ تو انسان کے اپنے ذوق پر منحصر ہے کہ وہ کس قسم کی تعلیم و تربیت
چاہتا ہے ورنہ جہاں تک ہماری شیتا کا تعلق ہے آپ اس سے
انگریزی میں تقریریں سنیں، ہندی میں، فرینچ میں، وہ ادب تاریخ
فلسفہ، پالٹکس کسی میدان میں بند نہیں ہے۔

جوکھم: وزن کے بارے میں کچھ بتایا نہیں آپ نے ؟ میرے لڑکے کو بھاری
بھرکم پسند نہیں آتیں۔

جوحکم داس: اجی آج کل کسی کو بھی پسند نہیں آئیں سیٹھ جی۔ زمانہ بدل گیا ہے
آج کل تو ہر شخص Latest design۔ اور سٹریم لائن
صورت پر فدا ہے۔ ہماری شینا بھی بالکل جدید مشین کی ہے۔
جوکھم: مگر وزن ؟
جوحکم داس: کہہ تو رہا ہوں حضور وزن صرف ایک سو بیس پاؤنڈ ہے۔ ایسی ہلکی
اور سبک اور نازک اندام ہے کہ جب جی چاہے گود میں اٹھا کر ایک
کمرے سے دوسرے کمرے میں لے جائیے (جیب سے سگریٹ نکال کر
سلگانے لگتا ہے۔)
جوکھم: لوکھم ؟
لوکھم: جی جوکھم۔
جوکھم: (سرگوشی میں) یہ لڑکی تو مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے!
لوکھم: (سرگوشی میں) اجی جو صفات یہ بیان کر رہا ہے اس سے آدھی بھی اگر
لڑکی میں موجود ہوں تو فوراً رشتہ کر لیجیے۔
جوکھم: میرا بھی ایسا خیال ہے (مڑ کر جوحکم داس سے) معاف کیجئے گا، ایک
ضروری بات پوچھنا بھول گیا ہوں۔ آپ انکم ٹیکس کتنا ادا کر رہے ہیں؟
جوحکم داس: انکم ٹیکس ـــ مگر انکم ٹیکس سے شینا کا کیا تعلق ہے؟
جوکھم: دیکھئے یوں تو کوئی تعلق نہیں ہے۔ لڑکی سے تو کوئی تعلق نہیں ہے
مگر آپ جانتے ہیں اس قسم کی باتوں میں حسب نسب بھی دیکھا جاتا ہے۔
جوحکم داس: اوہ ـــ سمجھا ـــ خوب سمجھا! ـــ اجی جناب سیٹھ جوکھم داس
صاحب! آپ یہ معاملہ کسی للّو پنجو سے نہیں کر رہے ہیں۔ ہماری فرم
گذشتہ پچاس سال سے اسی بمبئی میں کام کر رہی ہے۔ سارے دفاتر

بمبئی کے علاوہ کلکتہ، مدراس، بنگلور، دہلی اور ناگپور میں بھی ہیں۔ ...
ہمارا ہیڈ آفس نیویارک میں ہے، ایک فیکٹری لندن میں بھی ہے، ہم کتنا انکم ٹیکس دیتے ہیں اس کا کل اندازہ کرنا تو مشکل ہے کیوں کہ ہم صرف ہندوستان میں نہیں بلکہ دنیا کے دس ملکوں میں انکم ٹیکس ادا کرتے ہیں اور جو رقم ہم نے اس سلسلے میں گذشتہ سال ادا کی ہے اس کی مالیت دو کروڑ روپے سے کم نہ ہو گی۔

جوکھم: دو کروڑ روپے؟

جوحکم داس: جی ہاں!

جوکھم: لوکھم؟

لوکھم: جی جوکھم!

جوکھم: (سرگوشی میں) میرے خیال میں یہ معاملہ ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔

لوکھم: (سرگوشی میں) فوراً ہاں کر دیجئے۔

سیٹھ جوحکم داس اپنے چھوٹے بھائی سے گفتگو کر کے جوحکم داس کی جانب پلٹتا ہے تو جوحکم داس سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہتا ہے۔

جوحکم داس: کہئے کچھ اور پوچھنا ہو تو پوچھ لیجئے، اپنے دل کے سارے شبہات مٹا لیجئے۔

جوکھم: جی نہیں۔ اب نہ کچھ پوچھنا ہے، نہ کہنا ہے نہ سننا ہے نہ ہمارے دل میں کوئی شک شبہ کا باقی ہے ہمیں تو منظور ہے۔

جوحکم داس: آپ کو منظور ہے تو مجھے بھی منظور ہے۔

جوکھم: تو ملائیے ہات۔

جوحکم داس: (ہات ملا کر) جوحکم۔

جوکھم: اب فرمائیے منگنی کی کون سی تاریخ مقرر کی جائے؟

جوحکم داس: منگنی ؟ ــــ کیسی منگنی ؟

جوکھم : آپ بھی خوب مذاق کرتے ہیں سیٹھ جی، بھلا شادی سے پہلے منگنی نہیں ہوتی؟

جوحکم داس : شادی ؟ کس کی شادی ؟

جوکھم : آپ کی لڑکی کی میرے لڑکے سے شادی، میں نے اس سلسلے میں آج لوگوں کو انٹرویو کے لئے بلایا تھا۔

جوحکم داس : مگر میری تو کوئی لڑکی ہی نہیں ہے۔

جوکھم : لڑکی نہیں ہے ــــ تو پھر اب تک یہ گفتگو کس سلسلے میں ہوتی رہی ہے۔ یہ شینا کون ہے ؟

جوحکم داس : شینا ؟ ــــ اوہ ــــ شینا تو ریڈیو گرام ہے۔ میں شینا ریڈیو گرام مشین کمپنی کا ایجنٹ ہوں۔ میں اپنی مشین بیچنے آیا تھا۔۔ ۔۔ کسی لڑکی کا سودا کرنے نہیں آیا تھا۔۔ ۔۔ معاف کیجئے گا، غلط فہمی ہو گئی۔

لو کھم داس، جوکھم داس، سیکریٹری سب ہکا بکا ہو کر جوحکم داس کی طرف دیکھتے ہیں۔ جوحکم داس اپنی ٹوپی میز سے اٹھا کر سر پر پہن کر افسوس سے سر ہلاتے ہوئے چلنے لگتا ہے۔

(پردہ)

●

غیر انسانی ظلم و ستم

ATROCITIES BY
MEN

Victim's ... Eichm...

... who escaped ... had forced hi... grave, told the ... trying Adolf Eichmann today how he ... ed search for hi...

Dr. ... Americ... New Je... day tha... shot he ... centration ... Ukraine, ... other inmates who had ... dead. While doing so he ... to escape.

Today, after the court had ... ruled a defence objection, he told of the activities of a Special S.S Unit formed towards the end of World War II to wipe out the evidence of the mass murders committed by the Nazis.

After his escape Dr. Wells was arrested again and put into a "death brigade" used for this work. One day they ... remove ... of 182 ... of the ... ... used his ... towards the ... people ...

...GADE

... death brigade" ... with a man ... devil ...

... later, while they were still warm, he had to put them into the fire."

Asked how long a man was normally kept in the "death brigade," Dr. Wells said: "We were told that after eight or ten days we had to be exchanged. We would be shot and another group would come."—Reuter

خالی قبر

خزاں کے پہلے دن تھے۔

صبح کا میلا کہرہ قیدیوں کی بیرکوں پر چھایا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ہوا میں کسی گندی گالی کی سی تیزی اور تلخی تھی۔ لنڈین کے پیڑوں کے آخری پتے سر جھکائے اپنی آخری گھڑی کے انتظار میں تھے اور انسانی لاشوں کو جلانے والی بھٹیاں آہستہ آہستہ دھواں اگل رہی تھیں۔

لیون نے اپنی قبر کھودتے کھودتے سر اٹھا کر پوپلر کے لمبے پیڑوں کی قطاروں کو دیکھا جن کے سفید رنگ تنوں سے یہودی قیدیوں کو باندھ کر گولی ماری جاتی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے اس کی سانس بند پرندے کی طرح اس کے سینے کے پنجرے میں رکی، پھر گھٹ کر آہ کی صورت میں باہر نکل آئی۔ اس ٹھٹھری ہوئی سانس سے اس کی چھاتی دہل گئی مگر گشت کرتے ہوئے نازی سپاہیوں کی چاپ میں کسی طرح کی لغزش پیدا نہ ہوئی۔ وہ اسی پابندی اور مضبوطی سے ان یہودی قیدیوں کے چاروں طرف گشت کرتے رہے جنہیں آج گولی ماری

جانے والی تھی اور جو اس وقت نازی سپاہیوں کی نگرانی میں کدالیں اور بیلچے لئے اپنی اپنی قبر کھود رہے تھے۔

لیون کی نظر پوپلر کے پیڑوں سے بھی اوپر میلے کہرے میں گھلتی ہوئی دھوئیں کی اس لکیر کو دیکھنے لگی جو کل تک کسی محبوبہ کی مہکتی ہوئی سانس تھی کبھی معصوم بچے کی مسکراہٹ تھی، کسی محبت کرنے والے سائنس داں، فلسفی اور ادیب کا دماغ تھی۔ آج ان سب کی جگہ دھوئیں کی ایک لکیر تھی جو جلنے والی بھٹیوں کی چمنیوں سے نکل کر کرہ ہوائی میں بکھر چلی تھی۔

جب قبریں کافی گہری ہو چکیں، تو نازی سارجنٹ زور سے چلایا "کام بند کرو"۔

سارے قیدیوں نے اپنی قبروں کے سامنے کدالیں اور بیلچے رکھ دیئے اور اٹینشن ہو کر کھڑے ہو گئے۔

"فارورڈ مارچ"! نازی سارجنٹ بڑے سخت لہجہ میں چلایا۔

لیون کے قدم مشین کی طرح پوپلر کے پیڑوں کی طرف بڑھنے لگے، جہاں کچھ منٹ کے بعد اسے گولی ماردی جائے گی، وہ آہستہ آہستہ اپنی موت کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے پیچھے دوسرے یہودی قیدی تھے، جو جگہ جگہ سے لا کر لوور کے نازی جیل خانے میں بند کئے گئے تھے۔ ان میں اس کا دوست اور ساتھی ابراہم بھی تھا، جو اسی کی طرح ہی سائنسداں تھا اور پولینڈ سے لایا گیا تھا، جہاں وہ کینسر کے مرض پر ریسرچ کر رہا تھا۔ سفید داڑھی والا بوڑھا ابراہم آج تک یہ نہ سمجھ سکا تھا کہ اسے کس جرم کی پاداش میں گولی ماری جا رہی ہے۔ وہ ہوتے ہوئے معصوم بچوں کی طرح روتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اس کے پیچھے اس کی دو نوجوان لڑکیاں ایتھیل اور روزا سولہ اور اٹھارہ سال

کی دوشیزائیں سر اونچا کئے بے خوفی سے چل رہی تھیں۔ ان کے پیچھے اور بھی یہودی تھے جو دوسری بیرکوں سے لائے گئے تھے اور جنہیں لیون پہچانتا نہ تھا سب سے آخر میں اس کی محبوبہ جینی تھی۔ کاش یہ نازی سپاہی اتنی سی مہربانی سے کام لیتے کہ اس کی محبوبہ کو اس کے ساتھ ساتھ موت کی طرف آخری گھڑیوں میں چلنے دیتے۔ لیکن نازیوں نے اس کی یہ معمولی سی درخواست بھی ٹھکرا دی تھی سب سے آخر میں تین سال کا ایک بچہ چل رہا تھا جس کے یہودی ماں باپ کو دو دن ہوئے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا تھا۔ وہ بچہ ایک ہاتھ جینی کے ہاتھ میں دیئے اور دوسرے ہاتھ کا انگوٹھا اپنے منہ میں چوستا ہوا چل رہا تھا ——— اپنی زندگی کے آخری ایام سے بے خبر۔

یکایک چلتے چلتے لنڈین کے نیچے سے گذرتے ہوئے کہیں دور اُوپر کی شاخوں میں ایک پتہ کھڑکھڑایا اور تیز ہوا کے جھونکے سے ٹوٹ کر زمین پر آگرا۔

ننھے بچے نے جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور زمین پر لڑھکتے ہوئے پتے کی طرف بھاگنے لگا۔ جینی نے اسے روکنا چاہا، دوسرے قیدیوں نے بھی اسے آوازیں دیں مگر کھلکھلاتا ہوا بچہ لائن توڑ کر ہرے پتے کی طرف بھاگتا جا رہا تھا۔ پتہ آگے آگے لڑھکتا ہوا جا رہا تھا اور بچہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا جا رہا تھا۔ آخر خوشی سے چیختے ہوئے اس بچے نے جھپٹ کر اس پتے کو اپنے ہاتھ میں دبوچ لیا۔

ٹھیک اسی وقت پیٹھ پر ایک گولی لگی اور وہ وہیں زمین پر گر گیا۔

اس کے ہاتھ میں وہی ہرا پتہ تھا اور یہی آخری پتہ تھا جو تین سال کے بچے نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

یہودی قیدیوں کی قطار میں غم اور غصے کی لہر دوڑ گئی مگر نازی

سپاہی رائفلیں تانے ان کے بالکل پاس آگئے اور بے بس ومجبور قیدی سر جھکا کر پھر پوپلر کے پیڑوں کی طرف بڑھنے لگے۔
لیون کے بالکل قریب بوڑھے مائنس والی ابراہم کو باندھا گیا۔ سب سے آخر میں جین کو باندھا گیا ـــــ جین، جو اس کی محبوبہ تھی، بھوری آنکھوں والی، بہادر جین، جس کے ہونٹوں پہ سرخ لپسٹک چمک رہی تھی۔ یہ کسی نخرے والی عورت کی ادا نہیں تھی، یہ موت کے خلاف ایک معصوم اور بہادر لڑکی کی بغاوت کا اعلان تھا۔
جب سب یہودی پیڑوں سے باندھ دیئے گئے، تو نازی سپاہیوں نے اپنی ... جگہوں پر کھڑے ہو کر رائفلیں تان لیں۔
ٹھیک اسی وقت ایک سپاہی بھاگتا ہوا آیا اور سارجنٹ سے کہنے لگا۔ "لاشیں جلانے والی بھٹیوں پر ایک آدمی کم پڑ گیا ہے اور نئے قیدی تو کل آئیں گے۔"
سارجنٹ نے ہاتھ کے اشارے سے سپاہیوں کو گولی مارنے سے روک دیا اور خود گھوم گھوم کر پیڑوں سے بندھے ہوئے ایک ایک قیدی کو دیکھنے لگا۔ ہر قیدی اس کی نگاہوں کے نیچے کانپ رہا تھا۔ یہ سارجنٹ ایک کو ایک دن کی زندگی دے سکتا ہے۔ جانے وہ کون خوش قسمت ہوگا۔
سارجنٹ کی وہ بے رحم نظر سب قیدیوں پر سے پھسلتی ہوئی آخر لیون کے چہرے پر رک گئی۔
لیون نے چلا کر کہا: "نہیں سارجنٹ، مجھے نہیں، یہ دن تم جین کو دیدو، ابراہم کو دیدو۔"
"ایک ہی تو دن ہے۔" نازی سارجنٹ نے بے حد نفرت کے ساتھ کہا۔

"ایک ہی تو دن ہے"! لیون سوچنے لگا۔ مگر ایک دن میں کتنی سانسیں ہوتی ہیں، کتنے منٹ، کتنے سکنڈ، کتنے خیال، کتنے تصور! ایک دن کے دامن میں کتنی آرزوئیں، کتنی حسرتیں، کتنے پھول، کتنی کلیاں کھل جاتی ہیں۔ ایک دن پوری زندگی، پوری صدی، پوری تاریخ بن سکتا ہے۔ مگر اندھے شعور کی پتھریلی گھاٹیوں میں گشت کرتا ہوا نازی سپاہی کیا جانے کہ ایک دن میں کیا ہوتا ہے!

لیون نے اسی لمحہ بھر میں کھڑے کھڑے یوں سوچا اور ملتجی نگاہ سے سارجنٹ کی طرف دیکھنے لگا۔

مگر نازی سارجنٹ نے اس کی یہ التجا بھی ٹھکرا دی۔ "جین ایک کمزور لڑکی ہے" وہ بولا "اور ابراہم بوڑھا ہے۔ لاشیں جلانے والی بھٹی پر ایک مضبوط آدمی کی ضرورت ہے۔۔۔ ۔۔ ولیم" نازی سارجنٹ نے دہاڑ کر اپنے ایک سپاہی سے کہا "لیون کی رسیاں کھول دو"۔

کچھ منٹ کے بعد وہ بھٹی نمبر ۲ پر کام کرنے لگا۔ لاشیں جلانے والی بھٹیاں کنسنٹریشن کیمپ کے پچھلے سرے پر تھیں، اور اس سے پچاس ساٹھ گز کی دوری پر جیل خانے کا لوہے کا جنگلا تھا۔ اس جنگلے کے باہر بھی چاروں طرف نازی سپاہی پہرہ دیتے اور گشت کرتے تھے۔ مگر آج کہرا اتنا گہرا تھا کہ لوہے کے جنگلے کا ٹیڑھا میڑھا جال آدھے سے زیادہ کہرے میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا تھا اور نازی سپاہیوں کے چہرے کچھ لمحوں کے لئے کہرے میں ڈوب کر ابھرتے اور پھر اسی کہرے میں کھو جاتے تھے۔

پچاس گز کی دوری پر آزادی ہے۔ لیون بھٹی میں لاشیں جھونکتے جھونکتے سوچنے لگا ــــ صرف پچاس گز کی دوری پر! اس کے ساتھ دو نازی

سپاہی بھی کام کر رہے تھے اور تین یہودی۔

وہ ہرا پتہ پھر لیون کی آنکھوں میں لہرانے لگا جیسے اسے اپنے پاس بلایا ہو، زندگی کا پیغام دے رہا ہو۔

مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ لیون کام کرتا رہا اور سوچتا رہا۔ پھر بھٹی کے میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی اور ایک نازی سپاہی مدد کے لئے وہاں چلا گیا۔

اب صرف ایک نازی سپاہی تھا اور چار یہودی قیدی تھے۔ ان سب قیدیوں نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے ایک ہی خیال ایک وقت پر ان چاروں کے ذہن میں ابھرا ہو۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہوئے۔ اور وہ سب قیدی اب پہلے سے بھی زیادہ محنت اور لگن سے کام کرنے لگے اور کام کرتے کرتے نازی سپاہی کے نزدیک تر ہوتے گئے۔

نازی سپاہی نے ایک لمحہ کے لئے بھٹی کے اندر جھانک کر دیکھا اور کہا، "بس ٹھہر جاؤ، اب اندر جگہ نہیں ہے۔"

ٹھیک اسی وقت لوہے کے پنجے کی طرح ایک مضبوط ہاتھ نے اس کے منہ کو بڑی سختی سے ڈھک دیا۔ اس نازی سپاہی کے منہ سے چیخ تک نہ نکل سکی۔ پھر ان سب قیدیوں نے اسے اٹھا کر بھٹی میں جھونک دیا اور باہر سے دروازہ بند کر دیا۔

پھر وہ پچاس گز کی دوری پر لوہے کے جنگلے کی طرف بھاگے۔

دھند گہری اور موٹی تھی، کہرا میلا اور گندا تھا۔ لوہے کے تاروں کے جال سے قیدی مچھلیوں کی طرح نکل نکل کر بھاگنے لگے۔ اتنے میں گشت کرنے والے سپاہی نے انہیں دیکھ لیا۔ خطرے کا سائرن زور زور سے

بجنے لگا۔ رائفلیں تانے نازی سپاہی دوڑنے لگے اور چاروں طرف ہلہ ہوگیا۔
لیون گہری دھند میں بھاگا جا رہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں سنسناتی ہوئی گولیاں نکل گئیں مگر وہ ایک ہی جانب بھاگتا رہا۔ مغرب کی طرف فر کے پیڑوں کا بہت بڑا ایک جنگل تھا۔ اگر وہ کسی طرح وہاں پہنچ جائے!
جنگل کے اندر دور تک جا کر وہ گھاس پر گر پڑا۔ پھر کچھ لمحوں کے بعد اسے کچھ ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے۔ اب صرف اسے اتنا یاد تھا کہ بے ہوش ہونے سے پہلے اس کے افق پر ایک ہرا پتہ چمکا تھا۔
کئی مہینے تک وہ ایک روسی کسان کے گھر میں چھپا رہا۔ اس زمانے میں نازیوں کی مقبوضہ لائن میں کسی یہودی کو پناہ دینے کی سزا موت تھی۔ مگر اس بہادر کسان نے بڑی دلیری سے اس خطرے کا مقابلہ کیا اور لیون کو اپنے گھر میں پناہ دی۔ پھر جب لگاتار روسی حملوں سے نازی فوجیں یوکرین سے بھاگنے پر مجبور ہوگئیں تو واپس جاتے ہوئے سارے پیچھے کے گاؤں اور ان کے گھروں کو جلاتے لوٹتے اور تباہ کرتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگیں۔ نازی فوجوں کے جاتے وقت لیون بدقسمتی سے پھر پکڑا گیا۔ نازیوں نے اسے پناہ دینے والے روسی کسان کو اسی وقت گولی سے اڑا دیا اور لیون کو پھر لوو کے نازی جیل خانے میں بھیجدیا۔
مگر اس بار جیل خانے میں کسی نے لیون کو نہ پہچانا۔ ایک تو کئی مہینوں کی بڑھی ہوئی داڑھی اس کے چہرے پر تھی۔ لگاتار مصیبتیں جھیلنے اور بھوکے رہنے کی وجہ سے اس کی صحت بہت گر گئی تھی۔ جیل خانے کا ڈھنگ بھی اب بدل چکا تھا۔ یوکرین سے پیچھے ہٹتے وقت ہٹلر نے حکم دیا تھا کہ کنسنٹریشن کیمپوں کے سارے نشان مٹا دیئے جائیں۔ تاکہ دنیا کو ہٹلر شاہی کے ظلم و ستم کا ثبوت نہ مل سکے۔

نازی سارجنٹ کائیٹیل ایک فہرست لیکر لیون کے پاس آیا اور بولا
"جوزف! (کیوں کہ لیون نے اب کے اپنا نام بدل لیا تھا) تمہارے گروپ
میں دس یہودی ہیں۔ اور اس فہرست میں ۱۸۲ یہودی قیدیوں کے نام ہیں
جنہیں سلسلہ وار ۱۸۲ قبروں میں گاڑا گیا ہے۔ تم لوگوں کو ہر قبر کو کھودنا
ہوگا اور پہچان کے لئے ہر لاش کے ساتھ قبر میں جو کارڈ دفن ہے، اسے
نکال کر فہرست سے چیک کرنا ہوگا اور چیک کرنے کے بعد گڑے مردوں
کی لاشوں کو باہر نکال کر بھٹی میں جلا دینا ہوگا، اور اس قبر کو پاٹ دینا ہوگا
کہ اس کا نام ونشان کبھی کسی کو نہ ملے۔ اور یہ سب کام چار دن میں ختم کر دینا ہوگا۔"
"چار دن تو بہت کم ہوں گے صاحب!" جوزف یعنی لیون نے سر جھکا کر
بڑے ادب سے کہا۔
"تو ایک دن اور لے لو، ایک دن اور کیا ہوتا ہے"! سارجنٹ کائیٹیل
نے بڑی لاپروائی سے کہا۔
"ایک دن اور"! لیون نے بڑے دھیان سے سوچا۔
مگر لیون کو زیادہ سوچنے کا موقع نہ ملا۔ وہ بہت جلدی قبریں کھودنے
اور کھود کر لاشیں نکالنے، نکال کر انہیں جلانے کے کام میں لگا دیئے گئے۔
پہلا دن اس کام میں گذر گیا، پھر دوسرا دن بھی گذر گیا پھر اس رات
جانے کیا ہوا کہ نازی سارجنٹ نے لیون کے گروپ کے تمام قیدیوں کو جگا کر
زمین بھرنے کے کام پر لگا دیا، حالاں کہ وہ دن بھر کام کر چکے تھے اور رات
کو کبھی کام نہ ہوتا تھا مگر نازی سارجنٹ بے حد بوکھلایا ہوا اور ڈرا ہوا معلوم
ہوتا تھا۔ شاید مورچے پر سے کوئی بہت بڑی خبر آئی تھی۔
وہ لوگ رات بھر قبروں پر کام کرتے رہے۔ جو قیدی تھک جاتا تھا

اسے نازی سپاہی رائفل کے کندے سے مار مار کر پھرسے کام کراتے تھے جیسے ان کے سر پر بھوت سوار ہو۔ کام کراتے کراتے نازی سپاہی خوف زدہ نگاہوں سے پیچھے دیکھ لیتے۔ ہوتے ہوتے سب قبریں سپاٹ ہو گئیں۔ اب صرف چار قبریں باقی رہ گئیں۔

سارجنٹ کائیٹیل فہرست دیکھ کر بولا: "ابراہیم ایہرین برگ"!

"مردہ موجود ہے"۔ ایک قیدی کھلی قبر کو دیکھ کر بولا۔

"ایتھیل ایہرین برگ"۔

"مردہ موجود ہے"۔

"روزا ایہرین برگ"!

"مردہ موجود ہے"۔

"لیون ویلز"؟ سارجنٹ کائیٹیل نے فہرست کا آخری نام پڑھتے ہوئے پوچھا۔

"قبر خالی ہے"۔ لیون نے قبر دیکھ کر جواب دیا۔

"قبر خالی ہے؟ کیسے خالی ہے"؟ سارجنٹ کائیٹیل حیرت سے بولا۔

نازی سارجنٹ قبر کے چاروں طرف گھوما۔ پھر بڑی مایوسی سے بولا "یہ کیسے ممکن ہے! نازی فہرست میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی۔ سب کو ہم نے مارا، سب کو ہم نے گاڑا، مردہ یہاں موجود ہونا چاہئے"۔

"مگر مردہ یہاں موجود نہیں ہے"۔ لیون کی آواز میں طنز کی ہلکی سی لہر تھی۔

"تو پھر مردہ کہاں گیا"؟ کائیٹیل سوچنے لگا۔ مردہ خود چل نہیں سکتا۔ مردہ بھاگ نہیں سکتا، پھر مردہ کہاں گیا"؟ بولا: "جلدی بتاؤ، ورنہ تم سب کو گولی مار دوں گا"۔ سارجنٹ کائیٹیل نے غصے سے رائفل تان لی۔ سارے قیدیوں کے چہرے ڈر سے سوکھ گئے، سوائے لیون کے۔۔۔۔۔

لیون دھیان سے پورب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہاں سے روشنی کا لاوا

اہلی سا تھا، لیکن یہ صبح کی روشنی نہ تھی بڑھتی ہوئی روسی فوجوں کا لاوا تھا۔

"جلدی بتاؤ...... ! مجھے بیوقوف مت بناؤ" نازی سارجنٹ بولا۔ اس کی آواز میں خوف کی لرزش تھی "بھلا مردہ خود چل کر کہیں غائب ہو سکتا ہے"!

لیون ایک لمحہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ دوسرے لمحے ساری فضا آگ اور بارود کے دھماکے سے گونج اٹھی۔ لوود کے کیمپ کے چاروں طرف۔ روسی فوجوں کا حملہ ہو گیا۔ نازی سپاہی خوف دہراس کے مارے ادھر ادھر بھاگنے کی کوشش کرتے لگے۔ سارجنٹ کا پیٹیل بھی ایک طرف کو بھاگنے لگا مگر لیون نے اسے گردن سے پکڑ لیا۔ اس کی رائفل چھین لی اور اسے زبردستی سے اپنی خالی قبر کے پاس لا کر بولا "سارجنٹ کا پیٹیل! نازی کی فہرست میں ایک غلطی باقی رہ گئی۔ وہ انسان کے جذبۂ آزادی کو بھول گئے، وہ یہ بھول گئے کہ مردے بھی چل کر واپس آسکتے ہیں اور ایک دن میں تاریخ بھی بدل سکتی ہے۔ سارجنٹ کا پیٹیل! میں جوزف نہیں ہوں، میں لیون ویلز ہوں! غور سے اس خالی قبر کو دیکھو۔ جو میری لاش کے لئے کھودی گئی تھی۔ جانتے ہو سارجنٹ کا پیٹیل، یہ قبر خالی کیوں ہے"؟

"نہیں"! سارجنٹ کا پیٹیل نے کہا۔

لیون نے سر اونچا کر کے پورب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اب اس خالی قبر میں نازی واد دفن کیا جائے گا"

THE FREE PRESS BULLETIN

BOMBAY TUESDAY AUGUST 30, 1960

NO SMOOTH COURSE!

A Bangalore ... as provided one more co... sense of justice w... wed with. Ap-pe... ge against him he ... magistrate was on ...

saying ... the driver ... the the gown ... into

It was and noble others. It is try himself a and the judge

Alas, how ... it is that the course of justice is never smooth! The driver was summarily prosecuted before another magistrate who imposed on him a fine.

انصاف

آسان

نہیں

BOMBAY, Jan. 31 (PTI) —The Forward Markets Commission has removed the present ceiling of Rs. ... per 250 kilograms for trading in groundnuts May hedge ...

ٹیکسی ڈرائیور

عدالت ۱۲ کا کمرہ ملزموں، وکیلوں، مدعیوں، گواہوں اور تماشائیوں سے بھر گیا تھا۔ ساڑھے گیارہ بج چکے تھے اور عدالت کی کرسی ابھی خالی تھی۔

اس عدالت کے سامنے مجرم ٹیکسی ڈرائیور کی آج بارہویں پیشی تھی پچھلے چار مہینوں میں وہ گیارہ بار اس عدالت کے سامنے پیش کیا گیا تھا اور ہر بار پیشی اگلی تاریخ پر ٹل جاتی تھی اور اس کے کیس کی باری نہیں آتی تھی۔ پچھلے چار مہینوں میں وہ گیارہ دن ٹیکسی نہیں چلا سکا تھا اور جب ٹیکسی نہیں چلتی ہے تو گھر کا خرچ نہیں چل سکتا اور بچوں کا اسکول نہیں چلتا ہے اور بنئے کا کھاتہ نہیں چلتا ہے، صرف بیوی کی زبان چلتی ہے۔

کوئی بڑا مقدمہ بھی نہیں تھا اس کا ___ اس نے شہر کے سب سے بڑے آدمی کی کار کو بڑی تیز رفتار سے جا لیا تھا اور ہزار کوشش کرنے کے بعد بھی اس نے بڑے آدمی کی کار کو اپنے سے آگے نہ بڑھنے دیا۔

حالاں کہ بڑے آدمی کی گاڑی اس کے پیٹ کی طرح بڑی تھی اور اس کی حرص کی طرح لمبی تھی، اور اس کا رنگ ایک چھنال عورت کے میک اپ کی طرح بھڑکیلا تھا۔ تو بھی بکرم کی ٹیکسی نے اسے مات دیدی۔ اس میں بکرم کی ٹیکسی سے زیادہ بکرم کی چالاکی کا دخل تھا۔ کیوں کہ مشین تو انسان کے ہاتھوں سے چلتی ہے۔ بڑے بڑے آدمی کبھی کبھی یہ بھول جاتے ہیں کہ شہر کا سب سے بڑا آدمی بھی ایک معمولی ٹیکسی ڈرائیور کی جرأت پر بے حد خفا ہو گیا تھا اور اگلے چوک پر رک کر اس نے ٹریفک انسپکٹر سے ایک کم حیثیت ٹیکسی ڈرائیور کی ڈھٹائی کے خلاف شکایت کر دی تھی۔

بکرم کو اس عدالت سے زیادہ سے زیادہ دس روپیہ جرمانہ ہوتا مگر وہ بڑا آدمی بڑا مصروف آدمی تھا، کسی طرح پیشی پر حاضر نہ ہوتا تھا اور بکرم کو عدالت میں حاضر ہوتے آج گیارہ دن ہو گئے تھے۔

اس نے گھبرا کر اپنے وکیل سے پوچھا "کیا جج صاحب آج نہیں آئیں گے ؟"

"کیا معلوم!" اس کے وکیل نے بڑی بیزاری سے اسے جواب دیا۔ کیوں کہ بکرم نے اپنے وکیل کو ہر پیشی پر تین روپے دینے کا وعدہ کیا تھا اور اپنی سمجھ میں اس نے بڑا سستا سودا کیا تھا۔ بکرم کا خیال تھا کہ یہی دو ایک پیشیوں میں فیصلہ ہو جائے گا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ معاملہ اس قدر لمبا کھنچے گا کہ اسے تین کی بجائے تینتیس روپے دینے پڑ جائیں گے اور وکیل اس لئے سختی سے جواب دے رہا تھا کہ بھلا آخر تین روپے والے کیس کو اور کس طرح جواب دیا جا سکتا ہے۔ اب اگر بیس پچیس کا معاملہ ہوتا تو وکیل بھی مسکراتا۔ ہر وکیل کی مسکراہٹ اس کے تنگ سے ہونٹوں

میں کھنچی رہتی ہے اور اس مسکراہٹ کو کھولنے اور باہر لانے کے لئے الگ الگ میٹر ہیں۔ کسی وکیل کی مسکراہٹ پانچ روپے پر کھلتی ہے تو کسی کی پچاس روپے پر تو کسی کی ہزار روپے پر۔ وکیل کے میٹر اور ٹیکسی کے میٹر میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مجرم نے بڑی بےزاری سے سوچا۔ اب میں اس ظالم کو تینتیس دے چکا ہوں مگر یہ کبھی سیدھے منہ سے مجھ سے بات نہیں کرتا، کیوں کہ میں تین روپے والی آسامی ہوں، اب میں اس سے کیا کہوں۔ جرمانہ تو مجھے دس روپے سے زیادہ نہ ہوگا لیکن وکیل کو تینتیس روپے دے چکا ہوں۔

"پلیش کار سے معلوم کیجئے کہ عدالت آج آئے گی کہ نہیں آئے گی، میرا کیسی کا نقصان ہوتا ہے" مجرم نے بڑے اداس لہجہ میں اپنے وکیل سے کہا۔

وکیل نے گھڑی دیکھ کر کہا "اوہ! پونے بارہ ہو گئے، میرا ایک مقدمہ عدالت ۷ میں ہے میں وہاں جاتا ہوں تم یہیں کورٹ کے اندر بیٹھے رہو یا کھڑے رہو مگر رہو اسی کورٹ کے اندر۔ اگر تمہارا بلاوا آئے تو مجھے فوراً کورٹ ۲ سے بلا لینا۔

وکیل اپنا پھٹا کالر سہلاتا ہوا اپنی بوریوں کی طرح لٹکی ہوئی پتلون کو جھلاتا ہوا کورٹ ۷ کی طرف چلا گیا۔ عرصہ ہوا اس نے ایک بڑے ایڈوکیٹ کی بدصورت لڑکی سے یہ سوچ کر شادی کی تھی کہ اس کا سسر اپنے داماد کو ایڈوکیٹ بنا دے گا، مگر شادی کے چھ مہینے بعد ہی وہ بڑا ایڈوکیٹ چل بسا، پھر اگلے دس سالوں میں اس کے سات بچے ہو گئے، پھر اس کے کوٹ کا کالر پھٹ گیا۔

تین روپے میں تم کیا کر سکتے ہو، اگر زندگی میں تلخی ہی تلخی رہ جائے تو

زبان پر مٹھاس کہاں سے آئے۔ وکیل نے کورٹ ۲ کی طرف جاتے ہوئے سوچا۔

بجرم نے پہلے تو کورٹ ریڈر سے عدالت کے بارے میں پوچھنے کی کوشش کی، لیکن جب کورٹ ریڈر نے اسے جھڑک دیا تو وہ سہم کر پرے ہو گیا۔ دیر تک اپنی چھدری لیکن خوبصورت اور ملائم داڑھی سہلاتا رہا۔ اس کی داڑھی بڑی خوب صورت اور چھوٹی سی تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ اس کے خاندان کے سبھی مردوں کی آنکھیں خوب صورت تھیں اور چھوٹی چھوٹی خوب صورت سی داڑھیاں تھیں اور وہ سب لوگ اپنے سر پر بڑی بڑی جٹائیں رکھتے تھے، ریشم کے لچھوں کی طرح ملائم جٹائیں — بالوں کے یہ گھنے گچھے ان کے دھرم اور ان کی تہذیب کے پرانے نشان تھے۔ بجرم کے خاندان میں بڑے بڑے عالم فاضل اور پنڈت ہو گذرے تھے مگر زمانے کی گردش نے بجرم کو ٹیکسی چلانے پر مجبور کر دیا تھا۔

بجرم نے چاروں طرف بڑی بے بسی سے دیکھا، یکایک اسے کورٹ روم کے بائیں کونے میں آخری سرے پر ایک دروازے کے قریب جج صاحب کا اردلی نظر آیا۔ یہ اردلی خاص عدالت بہادر کا تھا۔ جب جج صاحب اپنے پرائیویٹ روم سے نکل کر باہر عدالت کے کمرے میں جاتے تھے تو یہ اردلی دو قدم پہلے آگے بڑھ کر پکارتا تھا، گویا ایک طرح سے بھری ہوئی عدالت کو جج صاحب کے آنے کی خبر دیتا تھا۔ پھر جج صاحب کالا چشمہ، کالا گاؤن اور دو پھندنوں والا سفید کالر پہنے ہوئے اندر تشریف لاتے اور ساری عدالت ان کو تعظیم دینے کے لئے کھڑی ہو جاتی اور اس وقت تک کھڑی رہتی جب تک جج صاحب عدالت کی اونچی کرسی پر نہ بیٹھ جائے۔ بجرم سب سے نظر بچا کر جج

کے پرائیویٹ کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوئے اردلی سے باتیں کرنے لگا۔

"عدالت بہادر کب آئیں گے؟"

اردلی بولا "وہ تو ٹھیک گیارہ بجے آتے ہیں جانے کیا بات ہو گئی آج ممکن ہے طبیعت خراب ہو۔"

"طبیعت خراب ہو گی تو عدالت نہیں لگے گی؟"

"ہاں۔"

"کوئی دوسرا جج نہیں آئے گا؟"

"کبھی کبھی آتا ہے — جب پہلا جج چھٹی لے لیتا ہے — لمبی! مگر آج کیا ہوگا، کسے معلوم شاید تھوڑی دیر میں جج صاحب کا ٹیلی فون آئے گا۔"

ابھی اردلی کے منہ سے یہ بات نکلی بھی نہ تھی کہ ٹیلی فون آ گیا اور اردلی ٹیلی فون سننے کے لئے جج صاحب کے پرائیویٹ کمرہ میں گھس گیا۔ مجرم بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ اردلی ٹیلی فون سننے لگا۔ مجرم کمرے کے اندر کھڑا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ صاف ستھرا کمرہ تھا۔ ایک طرف جج صاحب کے کھانے کی میز تھی، ایک طرف آرام کرنے کے لئے کوچ تھا، کچھ تپائیاں اور کرسیاں تھیں، لوہے کی ایک بڑی الماری تھی۔ سامنے دیوار پر تین کھونٹیاں تھیں۔ ایک کھونٹی پر عدالت کا گاؤن ٹنگا تھا، کالا چشمہ اور کالر ایک تپائی پر رکھا تھا۔ ایک طرف جج صاحب کی مدراسی پگڑی تھی جسے پہن کر وہ عدالت کے اندر تشریف لایا کرتے تھے۔

اردلی ٹیلی فون سن کر مجرم کی طرف مڑا اور بولا "جج صاحب نہیں آئیں گے انہیں زکام ہو گیا ہے۔" پھر فوراً ہی تیور بدل کر بولا "مگر تم اندر کیوں چلے آئے تمہیں معلوم نہیں کہ اس کمرہ کے اندر کوئی نہیں آ سکتا، باہر نکلو۔"

اردلی غصہ سے مجرم کی طرف بڑھا۔ مجرم نے فوراً اپنا مضبوط ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

عدالت کا کمرہ تماشائیوں سے اور باہر کے وکیلوں سے بھرتا جارہا تھا کیوں کہ آج جج کی کرسی پر ایک نیا جج بیٹھا تھا جسے آج سے پہلے کسی نے نہیں دیکھا تھا اور تماشائیوں سے زیادہ وکیل لوگ یہ دیکھنے کو بے چین تھے کہ نیا جج کس طرح کے فیصلے کرتا ہے اور اس کی قانون کی جانکاری کا کیا حساب کتاب ہے۔

اس وقت مقدمہ کا مدعی بالاچندرن تھا۔ بالاچندرن نے اپنے گھر کا ایک کمرہ ایک بڈھی عورت اور اس کے بیٹے کو کرایہ پر دے رکھا تھا۔ بڈھی اور اور اس کا بیٹا دس سال سے اس کمرے میں رہتے چلے آئے تھے اور بڑی باقاعدگی سے کرایہ ادا کرتے تھے۔ پھر بڈھی کا جوان بیٹا اپنی مل میں ایک حادثہ کا شکار ہو کر مر گیا تھا اور بڈھی چھ مہینے سے کرایہ نہ دے سکی تھی، اور بالاچندرن بڈھی کو کمرہ سے نکالنے کے لئے عدالت کا حکم نامہ چاہتا تھا۔

جج نے بالاچندرن سے پوچھا: "تمہارے گھر میں کتنے کمرے ہیں؟"

"دس کمرے ہیں"، بالاچندرن نے جواب دیا۔

"اور تمہارے خاندان میں کتنے آدمی ہیں؟"

"میں اکیلا ہوں۔"

"اور تمہاری عمر کتنی ہے؟"

"ستر برس کی عمر ہے حضور!"

"تو ستر برس کے بڈھے کو دس کمرے کس لئے چاہئیں؟" جج نے پوچھا۔

"کیا تم ان دس کمروں میں سے ایک کمرہ اس بڈھی کو نہیں دے سکتے، جس کا جوان بیٹا چھ مہینے ہوئے کارخانہ میں مارا گیا؟"

بالاچندرن کا وکیل بولا: "حضور سیکشن نمبر فلاں فلاں کی شق فلاں فلاں کی دفعہ فلاں فلاں کی رو سے قانون کہتا ہے ... ..."

"اور انصاف کیا کہتا ہے"؛ نیا جج غرا کر بولا۔

اور بالاچندرن کا وکیل وہیں کھڑے کھڑے سہم گیا۔ پھر نئے جج نے مسکرا کر بالاچندرن کی طرف دیکھا جو ستر برس کا دبلا پتلا کمزور آدمی تھا جس کے چہرے پر ستر برس کی کنجوسی سے پیدا ہونے والے جذبات کے داغ تھے، وہ اپنے ہونٹ سکوڑے ماتھے پر ہزار شکنیں لئے چپ چاپ سب کے سامنے کھڑا تھا۔ نئے جج نے مسکرا کر بالاچندرن کی طرف دیکھا اور کہا، "تمہارے گھر میں کتنے نوکر ہیں"؟

"ایک بھی نہیں"، بالاچندرن نے جواب دیا۔

"کیا تم اکیلے نہیں محسوس نہیں کرتے"؟

وکیل کو بڑی حیرت ہوئی، وہ جج سے پوچھنا چاہتا تھا: یہ جج کس قسم کے سوال پوچھ رہا ہے، ان سوالوں کا مقدمہ سے کیا تعلق ہے؟ مگر اسے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔

"کبھی کبھی اکیلا محسوس کرتا ہوں"۔

"کیا تم یہ محسوس نہیں کرتے کہ کوئی تمہارا کمرہ جھاڑ دے، تمہارے کپڑے وقت سے نکال دے، تمہارے لئے نہانے کا پانی رکھ دے، تمہارے لئے ناشتہ تیار کر کے لے آئے اور رات کو جب تم سو جاؤ تو کوئی آہستہ سے تمہارے پاؤں دبا دے"۔

"محسوس کرتا ہوں حضور"۔

"اور اگر کوئی ان تمام خدمتوں کے بدلے تم سے تمہارے دس کمروں کے بڑے مکان میں صرف ایک کمرہ اپنے رہنے کے لئے چاہے اور کوئی تم سے

ایک پیسہ نہ مانگے صرف ایک کمرہ اور دو وقت کھانا ـــــــ تو کیا تم انکار کر دو گے"؟

بالاچندرن نے نا امید ہو کر کہا "مگر حضور ایسا آدمی اس دنیا میں آج کل کہاں ملے گا ؟ اسی لئے تو میں نوکر نہیں رکھتا"

بڑھی عورت کا چہرہ کھل اٹھا۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر جج کو دعائیں دینے لگی۔ پھر اس نے بالاچندرن سے ڈانٹ کر کہا ـــ "اب گھر چل تیرے کھانے کا وقت ہو گیا ہے"

بڑھی عورت نے بڈھے کو ہاتھ سے پکڑ لیا اور ساری عدالت کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بالاچندرن کے وکیل نے بہت سمجھایا "بالاچندرن تم گھبراؤ نہیں میں اس فیصلہ کے خلاف اپیل دائر کر دوں گا"

بالاچندرن نے کہا "تم ایسا کچھ نہیں کرو گے مجھے یہ منظور ہے" پھر وہ بڈھی کی طرف دیکھ کر مسکرایا، جیسے سوکھی دھرتی کے سینے میں نرمل جل کی دھارا پھوٹ پڑی ہو۔

(۲)

عدالت کے کٹہرے میں ایک خوب صورت اینگلو انڈین لڑکی کھڑی تھی۔ وہ اس طرح کھڑی تھی جیسے عدالت کے کٹہرے میں کسی نے ایک خوب صورت پھولوں سے بھرا گل دان رکھ دیا ہو۔ اس کے پیلے فراک پر اودے اودے پھول وکیلوں کی نظروں میں مسکرانے لگے۔ جج نے پوچھا "تو تم اپنے شوہر سے طلاق چاہتی ہو"

"جی ہاں"

"کیا تمہارا شوہر بے کار ہے"؟

"جی نہیں، وہ تو ریلوے میں ڈرائیور ہے۔"

اینگلو انڈین ڈرائیور بھی قریب ہی کھڑا تھا اور بار بار رومال سے اپنا گورا چہرہ پونچھتا جاتا تھا۔ آج اس کی بھرپور بے عزتی کا دن تھا۔ آج اگر یہ عدالت کا کمرہ کسی ریل گاڑی کا ڈبہ ہوتا تو وہ پوری ریل گاڑی کو کسی کھڈ میں پھینک دیتا۔

"تو تم اس سے طلاق کیوں چاہتی ہو؟"

"میرے شوہر کے منہ سے بو آتی ہے۔"

"کیوں آتی ہے؟"

"اسے ہر روز رات کے کھانے کے ساتھ بھُنی ہوئی لہسن کھانے کا بہت شوق ہے۔"

"تو تم اسے رات کو ٹوتھ برش استعمال کرنے پر مجبور کیوں نہیں کرتیں؟"

"میں تو کہتی ہوں اسے پر یہ مانتا نہیں۔"

"اگر تم سونے سے پہلے ایک ٹوتھ برش پر ٹوتھ پیسٹ لگا کر اس کے منہ میں دیدیا کرو تو کیا یہ دانت صاف کرنے پر مجبور نہیں ہو جائے گا؟"

لڑکی چپ ہو گئی، پھر بولی: "اور حضور یہ آدمی روز رات کو جوتوں سمیت میرے بستر میں گھس آتا ہے۔"

"تو پھر تم بھی جوتوں سمیت سو جایا کرو۔" جج نے کہا۔ "بڑی آسان ترکیب ہے، دو دن میں اس کی عادت ٹھیک ہو جائے گی۔"

"مگر" اینگلو انڈین لڑکی کا وکیل بولا۔ "تعزیرات ہند کی سیکشن فلاں فلاں کی دفعہ فلاں فلاں کے مطابق اگر شوہر بیوی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"تم چپ رہو۔" جج نے وکیل کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "شوہر بیوی کے

معاملے میں تم بولنے والے کون ہوتے ہو؟"

پھر جج نے ٹائپسٹ کو اپنا فیصلہ لکھواتے ہوئے کہا: "لکھو! اگر شوہر جوتے پہنکر بستر میں گھسنے کی کوشش کرے تو بیوی کو بھی چپل پہن کر سونے کا پورا پورا حق ہے۔ کیس ڈسمس"!۔

(۳)

اب کٹہرے میں چارلی ٹیکسٹائل مل کا مالک کرشنا چاری کھڑا تھا۔ وہ بے حد لمبا اور دبلا تھا۔ اس کے کانوں میں سفید ہیرے جگمگا رہے تھے اور وہ اپنی سفید ریشم کی قمیض اور دھوتی میں بالکل دیوتا معلوم ہوتا تھا۔ ایک ایسا دیوتا جو ابھی ابھی مندر سے اٹھ کر عدالت میں چلا آیا ہو۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں جو اس نے کٹہرے پر رکھی ہوئی تھیں، بڑی لمبی نازک نرم اور گداز دکھائی دیتی تھیں۔ وہ ایسے آدمی کی انگلیاں دکھائی دیتی تھیں جس نے زندگی بھر نوٹ گننے کے سوائے اور کوئی کام نہ کیا ہو۔ وہ عدالت کے کٹہرے میں بالکل آرام اور سکون سے کھڑا تھا۔

جج نے کہا: "تو تم اقبال کرتے ہو کہ تمہاری مل میں کام کرنے والے مزدور ریڈی کا ہاتھ مل کی ایک مشین سے کٹ گیا؟"

"جی ہاں۔"

"اور اس اقبال کے بعد بھی تم ریڈی کو جرمانہ دینے سے انکار کرتے ہو؟"

"جی۔"

"کیوں؟"

"کیوں کہ ریڈی کا ہاتھ اس کی غفلت سے کٹا ہے، اس کی اپنی غفلت سے۔ میری مل کی مشین خراب نہیں ہے۔"

"میری مل ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ تمہاری مل کیسے ہوئی ؟"
"حضور میں اس کا مالک ہوں۔"
"تم اس مل کے مالک کیسے ہوئے ؟"
"حضور میں نے اس پر روپیہ لگایا ہے۔ ستر لاکھ روپیہ اب تک لگا چکا ہوں۔"
"اور کتنا کما چکے ہو ؟"
"تین کروڑ چوالیس لاکھ۔"
"اگر اس مل میں ایک مزدور بھی کام نہ کرتا تو تمہارا منافع کتنا ہوتا ؟"
"یہ کیسے ہو سکتا ہے حضور ! اگر مل میں مزدور کام نہ کریں تو منافع کہاں سے آئے گا ؟"
"تو تم اقبال کرتے ہو کہ تمہارا ستر لاکھ روپیہ بجائے خود کوئی چیز نہیں ہے، جب تک انسان کے ہاتھ اس کو نہ چلائیں۔"
کرشنا چاری نے جھجکتے ہوئے کہا "یہ تو درست ہے حضور۔"
"تو جو ہاتھ منافع دیتے ہیں انہیں منافع کا حق دار کیوں نہ سمجھا جائے اس کے ہاتھ اگر کسی بھی غفلت سے، تمہاری یا ان کی غفلت سے کٹ جائیں تو ان ہاتھوں کے مالکوں کو زندگی بھر کے لئے پنشن کیوں نہ دی جائے ؟"
"مگر یہ تو مل مالک کے حقوق پر دست اندازی ہوگی" کرشنا چاری کا وکیل چلایا۔ "مگر شیکسن فلاں فلاں کی شق فلاں فلاں کی دفعہ فلاں فلاں کے مطابق مل مالک کی صحیح تعریف ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"
"کسی شریف آدمی کی تعریف کرو وکیل صاحب۔" جج نے غرا کر کرشنا چاری کے وکیل سے کہا۔ پھر مڑ کر ٹائپسٹ سے بولا۔ "لکھو فیصلہ،

کرشناچاری نے مل میں ستر لاکھ روپیہ لگایا اور تین کروڑ چوالیس لاکھ وصول کیا۔ لہٰذا وہ اپنا روپیہ مع سود کے واپس لے چکا ہے۔ لہٰذا آج سے یہ مل اس کی نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کی ہے جنہوں نے آج تک اپنے ہاتھوں کی محنت کی پونجی اس میں لگائی ہے اور آج تک لگاتے آرہے ہیں۔ اس کے علاوہ کرشناچاری چونکہ خود اپنے ہاتھوں کی محنت اس مل میں نہیں لگاتا ہے اور اس پر مل کے منافع کا مکمل دعوے دار بنتا ہے، لہٰذا یہ عدالت فیصلہ کرتی ہے کہ مل کے منافع میں سے ریڈی کے لئے عمر بھر کی پنشن جاری کی جائے اور کرشناچاری کے دونوں ہاتھ کاٹ لئے جائیں کیوں کہ وہ ہاتھ کوئی کام نہیں کرتے اور ہمارے ملک کو صرف کام کرنے والے ہاتھوں کی ضرورت ہے۔"

"کیا بکواس ہے"، کرشناچاری زور سے چلایا۔ "یہ جج ہے یا کوئی پاگل آدمی ہے؟" بہت سے وکیل غصہ سے بول پڑے۔

نیا جج کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک کھٹیچر وکیل اپنے پھٹے کالر سہلاتا ہوا بھاگتا کورٹ روم میں داخل ہوا اور کہنے لگا "اسے پکڑ لو، اسے پکڑ لو، یہ جج نہیں ہے۔ یہ تو میرا مؤکل ہے بجرم ٹیکسی والا ...... یہ جج کی کرسی پر کیوں اور کس طرح بیٹھا ہے؟"

کورٹ نمبر ۲ میں جب بجرم ٹیکسی والے کو پیش کیا گیا تو عدالت نے اس سے پوچھا: "تمہارا نام"؟

"وکرمادتیہ۔"

"عمر؟"

"دو ہزار برس۔"

"کیا کام کرتے ہو؟"

"ٹیکسی چلاتا ہوں۔"

"تم نے آنریبل عدالت کی غیر حاضری میں عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر عدالت کی ہتک کیوں کی؟" عدالت عالیہ نے پوچھا۔

سب لوگ حیرت سے بجرم ٹیکسی والے کی طرف دیکھنے لگے۔ دیر تک بجرم ٹیکسی والے کا سر جھکا رہا، پھر اس نے آہستہ سے سر اٹھایا اور بولا "حضور! زندگی ٹیکسی کی رفتار سے بھاگتی ہے لیکن قانون ابھی تک چھکڑے کی رفتار سے چلتا ہے۔ میں بے قصور ہوں حضور! میں عدالت کی کرسی پر نہیں بیٹھا تھا میں نے صرف اس کے ایکسی لیٹر پر پاؤں رکھا تھا۔"

"چھ مہینے کی قید با مشقت۔" عدالت نے اپنا فیصلہ سنایا اور پولس کے دو سپاہی وکرما دتیہ کو پکڑ کر عدالت سے باہر لے گئے۔

●

ہندوستان میں ہندی پاکٹ بکس کا سب سے پہلا اور ملک گیر شہرت کا حامل ادارہ

ہند پاکٹ بکس

جس کا معیار ضرب المثل اور مطبوعات مقبول عام ہیں

اب ہندی کے ساتھ ساتھ اردو پاکٹ بکس کے میدان میں بھی پیش پیش ہے۔ ہمارا مقصد نہ صرف اردو کے بلند پایہ مشاہیر کے شاہکار پیش کرنا ہے بلکہ ملکی و غیر ملکی زبانوں کے مفید و مقبول گراں مایہ ادب ۔ ناول، افسانہ، ڈرامہ، شاعری، طنز و مزاح، سیاحت، علم و سائنس، اخلاقیات، جنسیات وغیرہ۔ کو بھی اردو لباس پہنا کر ارزاں قیمت سے اہل ذوق تک پہنچانا ہے۔ ہماری اردو پاکٹ بکس کا مندرجہ ذیل پہلا سیٹ منظر عام پر آچکا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ سیٹ مطالعہ کے ہر تقاضہ کو پورا کرتا ہے۔

۱۔	کالج کے ٹکڑے	(طنزیہ افسانے)	کرشن چندر
۲۔	جوگیا	(رومانی افسانے)	راجندر سنگھ بیدی
۳۔	کامریڈ شیخ چلی	(مزاحیہ افسانے)	کنہیا لال کپور
۴۔	لندن کی ایک رات	(ناول)	سجاد ظہیر
۵۔	عورت اور آبشار	(ناول)	بلونت سنگھ
۶۔	محبت یا ہوس	(ناول)	ٹالسٹائی
۷۔	میلی چاندنی	(ناول)	گلشن نندہ
۸۔	اردو کی بہترین غزلیں	(شاعری)	مرتبہ: پرکاش پنڈت
۹۔	مرد عورت	(جنسیات)	ڈاکٹر لکشمی نرائن
۱۰۔	کامیابی کے راز	(اخلاقیات)	سوویٹ مارڈن

ہر کتاب کی قیمت صرف ایک روپیہ

ہند پاکٹ بکس پرائیویٹ لمیٹڈ، شاہدرہ، دہلی ۳۲